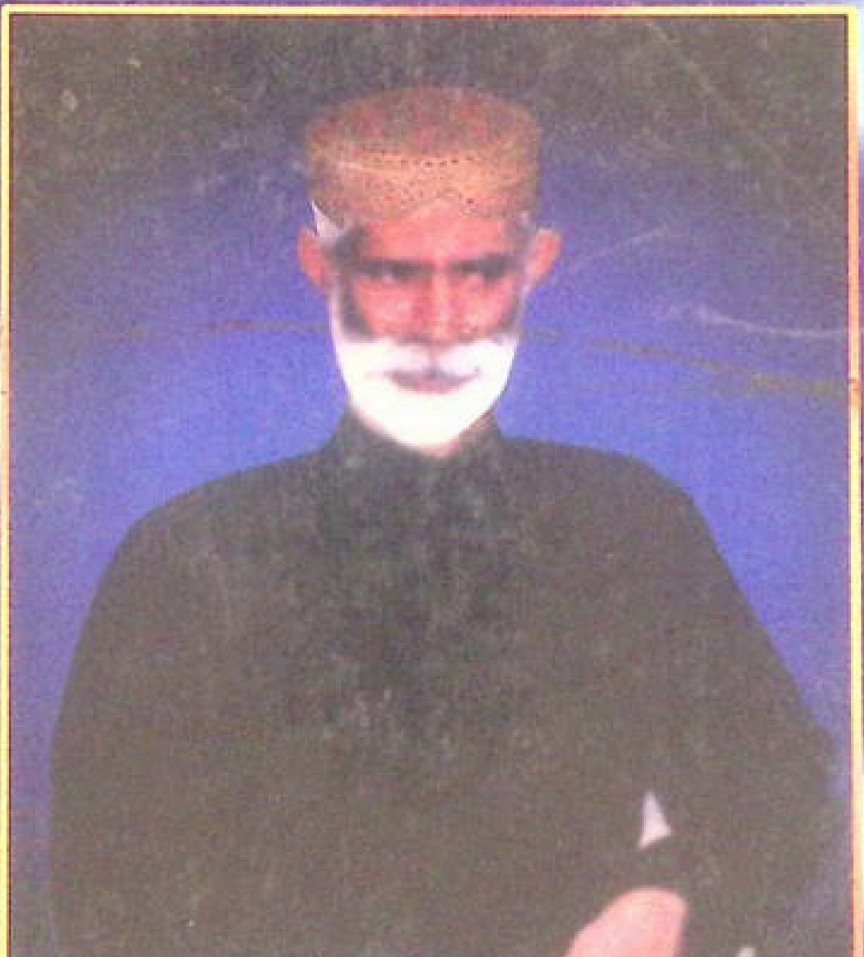
میر نادر عزیز کُرد

قوم پرستی سے اسلام تک



مؤلف

سید حسن مشہدی

انتساب

سید الشہداء

امام حسین علیہ السلام کے نام

جن کے خون کی حرارت

آج بھی مظلوموں اور محروموں کو

ظلم واستکبار کے مقابلے میں

عزم وحوصلہ اور استقامت عطا کرتی ہے۔

میر غلام غوث بزنجو

قوم پرستی سے اسلام تک

مؤلف

سید حسن المشہدی

بلوچستان ہسٹوریکل سوسائٹی

پوسٹ بکس نمبر ۳۱ جی پی او کوئٹہ

نام کتاب-----------میر نادر عزیز کرد

قوم پرستی سے اسلام تک

مصنف-----------سید حسن المشہدی

طبع-------------اول

اشاعت-----------جون 2003ء

کمپوزنگ-----------العابد کمپیوٹر گرافکس کوئٹہ

تعداد-------------ایک ہزار

قیمت-------------100 روپے

ناشر

بلوچستان ہسٹوریکل سوسائٹی

پوسٹ بکس نمبر ۳۱ جی پی او کوئٹہ

مقدمہ

بلوچ تاریخ اور بلوچ مزاحمتی تحریک سے متعلق معلومات کا حصول میرا شغف رہا۔ میر نادر عزیز کرد سے میری ملاقات عبدالوحید بلوچ نے کروائی جو راقم کے پرانے جاننے والے ہیں۔ عبدالوحید نے بتایا کہ وہ مجھے ایک صاحب سے ملوانا چاہتے ہیں جن کا تعلق ایک سیاسی گھرانے سے ہے وہ مجھے میر صاحب سے ملوانے کیلئے کیفے فرح واقع جناح روڈ میں لے گئے۔ جب ہم کیفے فرح کی طرف جارہے تھے تو عبدالوحید مسلسل میر صاحب کی شخصیت کی جاذبیت اور علمیت اور روحانیت اور معلوم نہیں کن کن پہلوؤں کی تعریف کررہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ عبدالوحید بہت مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔

کیفے فرح میں داخل ہوئے تو ایک کونے سے ایک دراز قد سفید ریش بزرگ نے کھڑے ہوکر ہمیں مخاطب کیا اور اپنی طرف بلایا۔ ہم سے باری باری گلے ملے۔ اور بڑی محبت سے حال احوال دریافت کیا۔ انتہائی دھیما لہجہ اور الفاظ کا خوبصورت انتخاب ان کی شخصیت کو چار چاند لگارہا تھا۔ وہ گفتگو کررہے تھے اور میں مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ کاش میں اس شخصیت سے دوبارہ مل سکوں۔ اس کے بعد میر صاحب کی دعوت پر ان کے دولت خانے پر بھی حاضری دی اور وہاں تین چار دن کے قیام کے دوران میر صاحب نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ بعدازاں مستونگ اور کوئٹہ میں میر صاحب سے مسلسل ملاقاتیں رہیں۔ اور ان ملاقاتوں میں، میں میر صاحب سے بلوچ تاریخ، خصوصاً بلوچ قوم پرستی اور مزاحمت کی تاریخ سے متعلق سوالات کرتا رہتا۔ میر صاحب کی گفتگو اور جوابات کے نوٹس بھی لیتا رہتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوا کہ میں نے ان کی گفتگو انٹرویو کے انداز میں ریکارڈ بھی کی۔ حالانکہ اس وقت میرے پیش نظر یہ بات نہیں تھی کہ مجھے کبھی ان پر کتاب لکھنی پڑے گی۔ یہ نوٹس وغیرہ تو راقم اپنی معلومات کیلئے لیتا تھا۔

پھر میر صاحب بیمار ہوگئے اور کراچی میں ان کو علاج کی غرض سے مقیم رہنا پڑا۔ اور

اتفاق سے ان دنوں راقم کا قیام بھی کراچی میں تھا۔ میر صاحب سے مسلسل ملاقاتیں رہیں۔ اور ان ملاقاتوں کے دوران میر صاحب سے جن موضوعات پر گفتگو رہی۔ انہوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر کیا عوامل تھے کہ ایک قد آور قوم پرست سیاسی شخصیت اپنے نظریات وافکار کو تج کر نئے افکار کی تلاش میں در بدر کی خاک چھانتی رہی۔ اسے کیوں کسی مقام پر سکون میسر نہیں ہوتا تھا وہ کیا تڑپ تھی۔ وہ کیا جستجو تھی۔ بس میں نے میر صاحب سے اسی حوالے سے گفتگو کرنا شروع کردی۔ اگر چہ میر صاحب ان دنوں ضعف و کمزوری کے باعث زیادہ دیر تک نہ تو بیٹھ سکتے تھے اور نہ ہی بول سکتے تھے لیکن راقم پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور بہت دیر تک گفتگو کرتے رہتے تھے ۔ زیر نظر کتاب ان انٹرویوز ، کی مدون صورت ہے۔ جو مختلف اوقات میں ان سے کراچی، کوئٹہ، مستونگ اور مچھ میں لئے گئے۔ بالفاظ دیگر یہ ان کے فکری و نظریاتی سفر کی کہانی ہے اور انہی کی زبانی ہے۔ کیونکہ میں نے پوری دیانت داری سے کوشش کی ہے کہ میر صاحب کے الفاظ میں بھی تبدیلی نہ کی جائے حتیٰ کہ ان الفاظ کو بھی جوں کا توں رہنے دیا کہ جو بلوچستان سے باہر کے لوگوں کیلئے نئے ہیں، تاکہ میر صاحب کے قریبی دوست احباب جو اس لہجے سے آشنا ہیں۔ وہ کم از کم اس وقت تک میر صاحب کا لمس اپنے اردگرد محسوس کریں جب تک کتاب ان کے ہاتھ میں ہو ۔ البتہ میر صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کو واضح کرنے کے لئے مختلف مقامات پر چند سرخیاں دی گئی ہیں جو کہ انٹرویو میں زائد محسوس ہوں گی لیکن قارئین کی سہولت کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ بندہ حقیر کی توفیقات میں اضافے کیلئے دعا فرمائیں۔

والسلام

حسن المشہدی

میر نادر عزیز کرد

میں 26 اپریل 1944ء کو مستونگ میں پیدا ہوا۔ ہم کل آٹھ بہن بھائی ہیں بہن بھائیوں میں میرا پانچواں نمبر ہے مجھ سے بڑے تین بھائی اور ایک بہن جبکہ دو بھائی اور ایک بہن چھوٹے ہیں۔ آبائی گاؤں مستونگ ہے البتہ دشت، کولپور، مچھ اور کوئٹہ میں ہمارے رشتہ دار اور قبیلے والے رہتے ہیں۔ ہمارا تعلق کرد قبیلہ سے ہے۔ جو مستونگ، بولان، خضدار اور کشمور میں آباد ہے۔ کرد تقریباً سب براہوی بولتے ہیں۔ تاریخی حوالے سے جب کبھی والد صاحب سے بات چھڑتی تھی۔ تو آپ کا کہنا تھا کہ ہم بلوچ اکراد قبائل دجلہ و فرات کے مرغزاروں میں آباد عظیم تہذیب و تمدن کے مالک تھے۔ واقعہ کربلا میں امام حسینؑ کا ساتھ دینے پر مصائب کا شکار ہونا پڑا اور اپنے قدیم وطن سے ہجرت کرنا پڑی اس بات کی تصدیق قدیم کتاب کردگال نامک[1] جو کہ اخوند صالح نے 1070ھ میں لکھی ہے سے ہوتی ہے جس میں تفصیلاً واقعہ کربلا کے بعد بلوچ اکراد قبائل کا تذکرہ ہے کہ جنہوں نے واقعہ کربلا کے بعد امام حسینؑ کا ماتم کیا۔ اور سوگ منایا۔ موجودہ بلوچستان میں آئے ہوئے ہمیں سات آٹھ سو سال کا عرصہ ہوا ہے ہجرت کی بنیادی وجہ ہماری بنو امیہ کی یزیدی آمریت کے خلاف بغاوت اور امام حسینؑ کی طرفداری تھی۔ شہادت امام حسین کے بعد ہم مسلسل آل رسول پر خون آشام مظالم پر احتجاج کرتے رہے۔ اور یزیدیوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیے رکھا۔ حجاج بن یوسف کے زمانے میں زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں۔ جس کی وجہ سے ہماری ہجرت خراسان کی طرف ہوئی۔ ہمارے بچپن تک ہمارے گھرانے میں محرم کا چاند نظر آتے ہی سوگ منایا جاتا تھا۔ ہم اسے براہوی زبان میں "اماماتا نوک" کہتے تھے اور محرم

---

[1] کردگال نامک مصنف اخوند محمد صالح ۱۰۷۰ء بمطابق ۱۶۵۹ء مرتبہ آغا نصیر خان احمدزئی مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

کے مہینے کو "اماماتا تو" "اماموں کا مہینہ" کہتے تھے۔ آج بھی دشت میں "مرو"[1] کے مقام پر ماتم کا میدان ہے جہاں باقاعدہ ہمارے بچپن تک ماتم کیا جاتا تھا۔

میرے دادا آپس میں چار بھائی تھے۔ دو بھائی سوشل رجحان کے حامل اجتماعی سرگرمیوں میں فعال تھے۔ جبکہ دیگر دو قبائلی طرز زندگی کے عادی بہادر اور جری تھے۔ اس زمانے کے اکثر معرکوں میں حصہ لیتے رہے۔ آج بھی ان کی جرات و بہادری کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔ دادا ظلن خان کرد انگریز کے زمانے میں جھگڑے اور اختلاف کے باعث افغانستان چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد واپس لوٹ آئے اور مستونگ جیل میں بحیثیت داروغہ جیل (Jail Suprentendent) ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت بلوچوں کی ریاست قلات ہوا کرتی تھی۔ جس کا حکمران خان قلات کہلاتا تھا۔

میرے والد

میر عبدالعزیز کرد 1907ء میں مستونگ میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر میں دادا کا انتقال ہوا۔ والد صاحب چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کر سکے۔ لیکن خداداد صلاحیت ذہانت اور کثیر المطالعہ ہونے کی بنیاد پر بہت زیادہ پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے۔ اور انہیں کئی زبانوں انگلش، فارسی، اردو، پشتو اور بلوچی پر عبور حاصل تھا۔ گھر میں بڑی وسیع لائبریری قائم کر رکھی تھی جس میں ہر قسم کی کتابیں موجود تھیں۔ ایک ملاقات میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے آپ کی علمیت سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا کہ میر صاحب آپ نے گریجویشن کہاں سے کیا ہے اس ملاقات میں عبدالصمد خان اچکزئی بھی موجود تھے۔ والد صاحب نے جواب دیا "چوتو[2] یونیورسٹی" سے اس پر پنڈت نہرو نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں مذاق نہیں کر رہا سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں تو خان صاحب نے جواب دیا کہ ہم بھی مذاق نہیں کر رہے ہے۔ انہوں نے کسی یونیورسٹی سے گریجویشن نہیں

۱۔ کوئٹہ اور بولان کا درمیانی علاقہ دشت مرو کہلاتا ہے

۲۔ مستونگ کے مضافاتی علاقہ کا نام

کیا۔ انکا تمام تر علم گھر بیٹھے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر ہے۔

بچپنا اور ابتدائی تعلیم

میرا زیادہ تر بچپن مستونگ میں گزرا۔ والد صاحب چونکہ قلات میں ہوتے تھے۔ وہاں بھی جانا آنا لگا رہتا۔ مستونگ ایک پر فضا جگہ تھی جو پھلوں اور کاریزات کی بہتات کی وجہ سے مشہور تھی۔ اب تو زیر زمین پانی نہ ہونے کی وجہ سے اجڑ چکا ہے۔ لوگ سیدھے سادھے اور ملنسار تھے۔ مجموعی ماحول پاکیزہ تھا۔ اس زمانے میں تعلیم کا معیار اچھا تھا۔ زیادہ تر باہر کے ٹیچرز تھے۔ طرز تعلیم زیادہ تر روایتی انداز کا تھا۔ طالبعلم پر بہت زیادہ مار پیٹ اور تشدد کیا جاتا۔ ایک دفعہ چند لڑکے اسکول سے بھاگ گئے۔ دوسرے دن ہیڈ ماسٹر نے انہیں اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ میں شروع سے ذہین اور حساس ذہن کا مالک تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر ضرورت سے زیادہ محسوس کرتا۔ ساتویں میں ایک دفعہ ٹیچر کی مار کی وجہ سے میں اتنا ڈسٹرب ہو گیا کہ میں نے اسکول سے بھاگنا شروع کر دیا یہ سلسلہ کچھ عرصے جاری رہا۔ اسی دوران اسکول میں ایک نئے ٹیچر ماسٹر غلام قادر بلوچ ٹرانسفر ہو کر آئے ان کی آمد میرے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجھے شفقت اور بہت حوصلہ دیا۔ اس زمانے میں انگلش آٹھویں کلاس سے بحیثیت مضمون شروع ہوتی تھی۔ مجھے انگریزی سے خصوصی لگاؤ پیدا ہوا۔ اور یہ میرا پسندیدہ سبجیکٹ بن گیا اور میں اس میں امتیازی نمبر لیتا رہا۔ میری یہ دلچسپی ایم اے تک برقرار رہی۔

اعلیٰ تعلیم اور مطالعہ

میٹرک میں نے 1963ء میں احمد یار خان ہائی اسکول مستونگ سے پاس کیا ایف اے گورنمنٹ کالج مستونگ اور گریجویشن 1967ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے پاس کیا۔ کالج کے ایام میں میرا پسندیدہ مضمون پولیٹیکل سائنس رہا۔ ایم اے انگریزی پنجاب یونیورسٹی سے اس زمانے کی بگڑتی ہوئی سیاسی صورتحال اور چند دیگر وجوہات کی بناء پر مکمل نہ ہو سکا۔ اب میری

مطالعاتی دلچسپی بین الاقوامی سیاسی و انقلابی تحریکیں نظام حکومت انقلاب اور تاریخ کی طرف ہو چکا تھا۔ خصوصاً اس زمانے میں مارکسسٹ اور سوشلسٹ تحریکوں کا بہت زور تھا۔ اس حوالے سے مارکس، لینن، ٹالسٹائی اور اینجلس کی کتابیں اور سوشلسٹ تحریک کو اپنے معاشرے کے حوالے سے عملی طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ اسپورٹس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ بچپن میں روایتی گھریلو کھیل کھیلتا رہا۔ اسکول میں فٹبال کھیلی۔

میری والدہ

میری ننھیال کا تعلق افغانستان سے تھا۔ انکا قبیلہ سادات کا مرید تھا۔ اور کچھ عرصے پہلے بلوچستان میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ والدہ طبعاً مذہبی تھیں۔ محلہ بھر میں آس پڑوس میں بیماروں کو دم درود کرتی رہتی تھیں والد و والدہ دونوں غریبوں کا درد رکھنے والے تھے۔ سوالی کو کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے۔ اگر دینے کو پاس کوئی چیز نہیں تو ادھار لے کر انکی ضرورت پوری کرتے۔ یہ بات میرے مشاہدے میں رہی کہ مختلف اوقات میں ایک یتیم بچہ ہمارے ہاں پرورش پاتا رہا۔ بلکہ کچھ ادوار میں تو بہت سے یتیم ایک ساتھ پلتے رہے۔ والدین کا برتاؤ ان سے مشفقانہ اور گھر کے دوسرے بچوں کی طرح ہوتا۔ کبھی ان کے ساتھ امتیاز نہیں برتا گیا۔ بچپن میں میں قرآن نہیں پڑھ سکا۔ تھوڑا بہت پرائمری اسکول میں پڑھا جب میرا مذہبی رجحان بڑھا تو میں نے قرآنی کیسٹوں اور ریڈیو کے ذریعہ اپنی تجوید درست کی اور اس طرح قرآن ختم کیا۔

گھر کا ماحول جہاں تک گھریلو ماحول کا تعلق ہے وہ علمی اور سیاسی زیادہ تھا۔ ہمارے گھر میں وسیع لائبریری تھی۔ جس میں ہر قسم کی کتابیں موجود تھیں۔ مذہبی کتابیں اور قرآنی تفاسیر کی تعداد زیادہ تھی۔ والد صاحب کی کتابوں میں نہج البلاغہ بھی تھی۔ والد صاحب کے علمی ذوق کی وجہ سے بچپن سے علمی ماحول میسر رہا۔ ہم میں بھی مطالعہ کا شوق والد صاحب کی وجہ سے آیا۔ وہ بہت زیادہ لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے۔ دیگر بھائیوں کی نسبت مجھے ان کے ساتھ وقت گزارنے کا زیادہ موقعہ ملا۔ اسی وجہ سے میں ان کے ذوق اور دیگر معاملات سے دوسروں کی نسبت زیادہ واقف تھا۔

اسکول کے زمانے میں چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھاتا بھی تھا۔ چھٹی کلاس کے بعد کہانیاں پڑھنے لگا۔ بعد میں نسیم حجازی کے ناول دلچسپی سے پڑھے والد صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں شوق سے پڑھتے تھے۔ میں نے بھی یہ کتابیں اس زمانے میں پڑھیں۔ علامہ اقبال کی پیام مشرق اور بانگ درا بھی والد صاحب کی تشویق پر پڑھیں۔

والد صاحب اور علامہ اقبال

والد صاحب علامہ اقبال کے بڑے قدردان تھے اور ان سے گہری ارادت تھی۔ ان کے آپس میں تعلقات بھی تھے۔ علامہ اقبال سے والد صاحب کی ایک ملاقات کا ہی اثر تھا۔ جب علامہ نے آپ کی سرزمین بلوچستان سے محبت حب الوطنی اور لوگوں کے حقوق کی تڑپ ملاحظہ کی تو نظم بوڑھے بلوچ کی اپنے بیٹے کو نصیحت لکھی۔

بڈھے بلوچ کی بیٹے کو نصیحت

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سردارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اخلاص عمل مانگ نیا گان کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

والد صاحب کا طرز فکر

والد صاحب ایک جملہ تکرار کے ساتھ دہراتے تھے کہ بچو علم حاصل کرنے کیلئے علم حاصل کرو۔ جس سے فکری بالیدگی پیدا ہو سکے علم کو ذریعہ معاش نہ بناؤ۔ والد صاحب کی یہ علم دوستی ہی تھی کہ انہوں نے مسلسل خان قلات کو براہوئی بیلٹ میں اسکول کھولنے کی ترغیب دلائی جہاں تک آپ نے آئیڈیل کا سوال کیا ہے بچپن سے جوانی تک میں والد صاحب کی شخصیت سے متاثر تھا۔ اور میں بھی ان جیسا بننا چاہتا تھا۔ لیکن اب میرے آئیڈیل امام حسینؓ ہیں

والد صاحب خداداد صلاحیت کے مالک اپنی اقدار و روایات سے محبت کرنے والے اصول پسند اور راست گو تھے۔ وہ بچپن سے ہمیں تعلیم، کردار سازی، اخلاقی خوبیوں اور ڈسپلن کی عملی تربیت دیتے۔ شدید غصے کی حالت میں بھی گالی کبھی ہم نے ان کے منہ سے نہیں سنی۔ ایک

دفعہ انہوں نے نہج البلاغہ پڑھنے کو دی۔ میرے کسی چبھتے ہوئے ریمارکس پر نصیحت کی بیٹا ہمیشہ خود تحقیق کرو۔ باپ دادا کے بتائے ہوئے راستے پر مت چلو۔ وہ اکثر تعصب تنگ نظری سے دور رہنے کی نصیحت کرتے اور کہتے کہ بغیر تحقیق کسی کے متعلق رائے دینے سے احتیاط کرو۔

وہ مذہبی آدمی نہیں تھے۔ آزاد خیال روشن فکر لبرل، ذہنیت کے حامل تھے۔ اسلام سے انہیں محبت تھی۔ اور محققانہ ذہن رکھتے تھے۔ معاملات کا عقلی بنیادوں پر تجزیہ و تحلیل کرتے اور کوئی بات بغیر منطق و دلیل قبول نہیں کرتے تھے قرآن پاک کی بہت سی تفاسیر کا مطالعہ کیا تھا۔ انہیں زیادہ سر سید احمد خان نے متاثر کیا تھا۔ اس بناء پر انہیں نیچری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ہمیں بھی کھلے دل و دماغ سے مطالعہ کی عادت ڈالنے کی کوشش کرتے۔ انہیں تعصب اور تنگ نظری سے چڑ تھی۔ اور ہمیشہ اس سے بچنے کی نصیحت کرتے۔ انکی روایتی مذہبی لوگوں سے دوری کی وجہ بھی اس زمانے کے علماء کا غیر معقولانہ رویہ انگریزی زبان اور اسکولز کی مخالفت، میڈیا تصویر لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی مخالفت اور جدیدیت سے فرار تھا۔ وہ انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کرتے لیکن یہ اتنے کم فہم، استدلال سے محروم اور بے بنیاد افکار کے شکار تھے کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھے۔ دوسرے والد صاحب کی کوشش یہ تھی کہ عالم اسلام کو اس ذلت اور پستی سے جدید اجتہاد کا دروازہ کھول کر نکالا جاسکتا ہے علامہ اقبال نے بھی جدید دنیا کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ آج عالم اسلام کی پستی اور زوال کی بنیادی وجہ جدید دور کے تقاضوں، لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی دنیا سائنسی ایجادات کے دور ہیں ہم وہی بارہ تیرہ سو سال پرانے اجتہادی نظام کو لئے بیٹھے ہیں ہر نئی سوچ فکر ایجاد اور علم کی محض اپنی کم علمی کی بنیاد پر مخالفت کرتے اور اسے خلاف اسلام قرار دے دیتے ہیں۔ اس حوالے سے مکتب اہل بیتؑ کے کی تعریف کرتے تھے کہ اسلام میں واحد مکتب فکر ہے کہ جن کے ہاں چودہ سو سالوں سے مسلسل اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جہاں کوئی نئی مشکل پیش آئی فوراً اجتہاد کر کے اسکا اسلام کے مطابق حل نکال کر اسے اسلامائز کرلیا۔

والد صاحب اور علمائے کرام

ہمارے گھر اکثر و بیشتر علمائے کرام تشریف لاتے تھے۔ جن میں مولوی محمد عمر پڑنگ آبادی، مولانا عرض محمد دیوبندی، مولوی محمد صدیق اور بہت سے افراد کہ جن کے نام مجھے یاد نہیں آرہے والد صاحب تفریح طبع کیلئے چائے سے پہلے کوئی مفروضہ بنا کر اختلافی سوال چھیڑ دیتے تھے۔ کہ مولوی صاحب اگر اللہ دو ہوتے تو اس کائنات میں کیا ہوتا۔ علماء بے ساختہ سنتے ہی استغفراللہ پڑتے اور ناراض ہو جاتے۔ والد صاحب کو نصیحت کرتے کہ میر صاحب ایسے سوالات مت کیا کریں۔ اس سے ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ والد صاحب ان کی اس کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہتے کہ مولوی صاحب اگر ایسے سوالات کا جواب عقلی بنیادوں پر تلاش کرلیا جائے تو ایمان اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اپنے ایمان کو کچے دھاگوں میں نہ باندھیں۔ اسے عقل و منطق اور استدلال کے گارے سے مضبوط کریں۔

والد صاحب ہمیں بھی آزاد اور غیر جانبدار مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتے اکثر کہتے بیٹا عقل و منطق کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ کیونکہ دنیا میں نیک و بد صحیح و غلط، خیر و شر کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ عقل ہے۔ عقل ہی کے ذریعہ اچھائی برائی کی پہچان ہوتی ہے۔ ہمارے پاس باطل مذاہب کو رد کرنے اور اسلام کی حقانیت قرآن مجید اور رسول اکرم کی رسالت کو ثابت کرنے کی واحد اور بہترین کسوٹی عقل ہے قرآن پاک بھی ہمیں قدم قدم پر عقل کے استعمال کی دعوت دیتا ہے۔ باپ دادا کی باتوں پر مت جاؤ۔ اندھی تقلید سے بچو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک محفل میں نواب عبدالقادر شاہوانی، میر غلام محمد قمبرانی اور چند دیگر افراد کہ جن کے نام اب مجھے یاد نہیں ہماری بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اور مختلف اسلامی مکاتب فکر اور فقہوں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ والد صاحب نے فرمایا کہ میں نے جہاں تک اسلامی تاریخ

کا مطالعہ کیا ہے وہ تو یہی بتاتا ہے کہ صرف فقہ اہل بیت امام جعفر صادقؑ کے صحیح اور حق پر ہے باقی تمام فقہ سرکاری فقہ ہیں جنہیں ہمیشہ حکومتوں کی پشت پناہی حاصل رہی ہے ظالم و جابر بادشاہوں آمروں نے اپنی ضرورت اور سیاسی مصلحتوں، بداعمالی، مظالم، کو شریعت کا لبادہ پہنانے کیلئے بنائے ہیں۔

ایک دن میں والد صاحب کی لائبریری سے کوئی دینی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جو غالباً حضور پاکؐ کی سیرت پر تھی۔ آپ نے کتاب کے کونے پر حاشیہ لگا کر لکھا تھا "کہ جب میں موجودہ دور کے مسلمانوں اور خصوصاً علماء کی حالت دیکھتا ہوں تو میں اسلام سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے کو مسلمان نہ کہلاؤں۔ لیکن جب سیرت رسول کا مطالعہ کرتا ہوں تو بے اختیار اسلام کی عظمت اور آپ کی محبت سے سینہ لبریز ہو جاتا ہے۔ ایسی آئیڈیل شخصیت "ذہن" میں ابھرتی ہے کہ جسکی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی"۔

تاریخ اسلام پر بھی والد صاحب سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے اسلام کی تاریخ اور ہے اور مسلمانوں کی تاریخ اور۔ اسلام کی تاریخ عدل مساوات احترام انسانیت شرافت اور دوسروں کے حقوق کا احترام بتاتی ہے جبکہ مسلمانوں کی تاریخ لشکر کشی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنا کنیزیں غلام خدم و حشم زر جواہر محلات شباب شراب کباب سے بھری پڑی ہے۔

جہاں تک روزگار کا تعلق ہے۔ ہماری مستونگ اور خضدار کے علاقے میں زمینیں اور باغات تھے کچھ میں کول مائنز بھی تھیں۔ لیکن والد صاحب کو ان چیزوں سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زیادہ تر قلات میں رہتے انہوں نے اپنے کو ریاست قلات کی بہبود کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ریاست کے وزیر ہونے اور برصغیر کی سیاست کے صف اول کے رہنما ہونے کے باوجود بچپن سے ہمارے معاشی حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ لیکن اسکے باوجود ہم مطمئن اور خوش تھے۔ کبھی کبھار عید پر ایسا وقت بھی آیا۔ کہ ہم رات کو کپڑے دھو کر صبح وہی پہن لیتے اسکے باوجود گھر میں سکون مہر و محبت کی فراوانی تھی۔

ہمارا گھرانہ مذہبی نہیں کہلایا جاسکتا البتہ والد صاحب کو اولیاء اللہ سے خاص انسیت اور اس راہ پر انہوں نے وقت بھی لگایا تھا۔ والدہ کی وجہ سے گھر میں نماز روزہ کی پابندی تھی۔ بچپن میں محرم کے ایام میں ہم محلے کے دوستوں کے کسی گھر سے چھینی کہیں سے نقد پیسہ جمع کر کے عاشورا کے دن نیاز تیار کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے یا حسین یا حسین بھی کہتے تھے کسی ایک نوجوان کو شمر بنا کر لاتے اور اسے مصنوعی انداز میں ذبح کرتے۔ یہ ساری رسمیں براہوی بیلٹ میں واقعات کربلا کو زندہ کرنے کی خاطر شروع سے چلی آ رہی ہیں اور تقریباً تمام براہوی بیلٹ میں یہی ہوتا تھا۔ لوگ چندہ جمع کرتے گیہوں جمع کر کے عاشورے کے روز کسی سید کے گھر یا قبرستان میں جمع ہو کر نیاز پکاتے اور یا حسین یا حسین کہتے اسے "حسینی کوہل" کہا جاتا تھا۔ بچپن میں ہر براہوی کے گھر میں دوازدہ امام چہاردہ معصومین کے نام بچوں کو یاد کرائے جاتے تھے۔ ہمیں بھی بچپن میں یاد کرائے گئے تھے۔

قوم پرست سیاست اور والد صاحب

والد گرامی میر عبدالعزیز کرد کو اگر عہد حاضر کی جدید بلوچ قوم پرست سیاست کا بانی ومعمار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے اس زمانے میں جب ریاست میں انگریز کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ ریاست میں لوگوں کی بغیر اجازت آمدورفت پر پابندی عائد تھی۔ حتیٰ کہ ریاست میں اخبار و رسالہ تک نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اس کٹھن اور تاریکی کے دور میں 1925ء میں اتحاد بلوچاں" نامی پہلی تنظیم قائم کی۔ جس نے انڈر گراؤنڈ کام کا آغاز کیا۔ جس نے انگریز سامراج کیخلاف آزادی کی جدوجہد کا شعور اور بلوچستان کی اولین سیاسی جدوجہد اور لوگوں میں سیاسی بیداری، حقوق کے حصول کی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ مستونگ اس زمانے میں بلوچستان کی سیاست کا مرکز تھا۔ اس سے پہلے برصغیر کی بڑی سیاسی جماعتیں اور رہنما ریاست میں سیاسی عمل کی بحالی کی کوششیں کر چکے تھے۔ لیکن انہیں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ریاست میں انگریزی سرکار کے باہر کے ملازمین جن میں وزیر اعظم شمس شاہ سر

فہرست تھا، نے عجیب دہشت گردی اور اندھیر نگری برپا کی ہوئی تھی۔ یہ شخص بڑا فرعون صفت مغرور ظالم اور متعصب شخص تھا۔ خان قلات میر اعظم خان جو کہ آنکھوں سے بھی معذور تھے، کو بے دست و پا کر رکھا تھا۔

شمس شاہ کے خلاف جدوجہد

چند سال بعد میر یوسف عزیز مگسی نے بھی اتحاد بلوچاں میں شمولیت اختیار کر لی اس سے پہلے یوسف عزیز مگسی، مگسیوں کی سرداری کے اختلافات کی وجہ سے مستونگ جیل میں قید رہ چکے تھے والد صاحب نے انہیں جیل سے فرار کروایا۔ اور سائیکل کے ذریعہ سپیزنڈ اسٹیشن پہنچایا جہاں سے وہ آگے نکل گئے۔ ان دونوں عزیزوں نے شمس شاہ کے خلاف پنجاب کے اخبارات میں مضامین لکھے۔ ریاست میں ہونے والی بدعنوانیوں پر سے پردہ اٹھایا ریاست میں آئینی عدالتی و سیاسی نظام کے قیام پر زور دیا۔ ان لوگوں کی جدوجہد کو دیکھتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے ایک نظم لکھی۔

ملت کو ہو نوید کہ افغان کی طرح
بخشی گئی بلوچ کو بھی زندگی نئی
پھر کر رہے ہیں بادشہوں سے مقابلہ
پتھر جنہوں نے پیٹ پر باندھے کئی
عبدالعزیز کرد پہ ایوبیوں کو ناز
عبدالصمد کی ذات پر نازاں اچکزئی

والد صاحب نے وزیر اعظم کے خلاف ایک تفصیلی کتابچہ لکھا جو "شمس گردی" کے نام سے مشہور ہوا، جس میں اسکی بدعنوانی کی قلعی کھولی گئی۔ اور مطالبہ کیا تھا۔ کہ ریاست میں سیاسی عدالتی قانونی اصلاحات کی جائیں۔ ریاست میں آئین سازی ہونی چاہئے اسمبلیاں بنائی جائیں اس پر والد صاحب اور عبدالصمد خان اچکزئی کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ تقریباً تین سال تک یہ لوگ

جیل میں رہے۔ 1935ء کے زلزلہ میں یوسف عزیز مگسی فوت ہو گئے۔آخرکار ان لوگوں کی جدوجہد رنگ لائی شمس شاہ کو برطرف کردیا گیا۔ خان اعظم خان کو تبدیل کر کے خان میر احمد یار خان کو خان قلات نامزد کردیا گیا۔ 1935 کی اصلاحی ایکٹ کے تحت انہیں جیل سے رہائی ملی عبدالصمد خان اچکزئی نے انجمن وطن کے نام سے نئی جماعت بنائی

قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی

1937ء میں والد صاحب نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ریاست کی پہلی باقاعدہ سیاسی پارٹی قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی اور اسکے پہلے صدر بھی وہ خود بنے۔ انکے ساتھیوں میں میر گل خان نصیر، میر محمد فاضل محمد شہی، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، ملک فیض محمد یوسف زئی، مولانا محمد عمر وغیرہ شامل تھے۔ اس پارٹی کی ابتدائی میٹنگیں رات کے وقت توت کے درخت کے نیچے ہوتی تھیں جس میں یہ لوگ باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے درج ذیل مطالبات رکھے۔

قلات اسٹیٹ کا آئین بنایا جائے انتخابات کروا کر اسمبلیاں بنائی جائیں اور باہر کے لوگوں کو ریاست کی ملازمتوں سے نکالا جائے۔

ریاست کے معاملات پولیٹیکل ایجنٹ کے بجائے خان قلات کے سپرد کیے جائیں۔

کچھی مکران اور ریاست کے دوسرے اضلاع میں یکساں قصاص و دیت کے قوانین نافذ کیے جائیں۔ غلامی کا نظام ختم کیا جائے۔ سرداروں کے اختیارات میں توازن پیدا ہو۔ غیر ضروری ٹیکس لینا بند کیئے جائیں۔

1939ء میں قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کا مستونگ میں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں تمام فعال کارکنوں نے شرکت کی۔ میر غوث بخش بزنجو اس زمانے میں علیگڑھ میں پڑھتے تھے ۔میٹرک کا امتحان پاس کر کے چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے خان قلات نے اس اجلاس کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اور اس کے انعقاد کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ اجلاس کامیابی سے منعقد ہوا۔ اسکے بعد والد صاحب نے میر گل خان نصیر، میر

حمل خان اور میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ ملکر ریاست کے اندرونی علاقوں کے دورے کیئے اور اپنی پارٹی کے موقف سے لوگوں کو اعتماد میں لیا۔ جس سے لوگوں میں نیا جوش وخروش اور بیداری پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اس پر انگریز حکمرانوں کے پریشر پر والد صاحب میر غوث بخش بزنجو اور دیگر ساتھیوں کو خان صاحب نے دوبارہ گرفتار کرلیا۔ لیکن یہ تحریک جاری وساری رہی۔

آئین اور اسمبلیوں کا قیام

آخر دباؤ کے نتیجے میں خان قلات نے مذاکرات کے بعد ان کے مطالبات تسلیم کرلیئے قلات اسٹیٹ کا پہلا آئین بنایا گیا۔ جسے والد صاحب نے مدون کیا۔ جسے قرآن سے اخذ کیا گیا تھا۔ ریاستی اسمبلیاں وجود میں لائی گئیں۔ اور نمائندگان کے انتخاب کی اجازت دی گئی ریاستی ایوانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

ایوان عام　　　　ایوان خاص

والد صاحب ایوان خاص کے ممبر بنے جبکہ میر غوث بخش ایوان عام میں تھے۔

والد صاحب کو خان قلات نے وزیر لے لیا۔ والد صاحب نے قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے بقیہ مطالبات اپنی ذاتی کاوش سے حل کروائے جس میں سے خاص طور پر مکران میں غلامی کے مسئلے کو عملاً ختم کردیا گیا۔ کچھی میں جاموٹ کے خون بہا کا مسئلہ حل کرایا۔

سرمستانی قوم کے خون بہا کا بھی مسئلہ حل کیا گیا سیاہ کاری کے خلاف تحریک چلائی ریاستی مسائل اور سرداروں کے معاملات پولیٹیکل ایجنٹ سے لے کر ریاست کے حوالے کردیے گئے۔

ریاست میں اصلاحات کے نفاذ کے بعد میر عبدالعزیز کی کوشش یہ رہی کہ برصغیر کی تقسیم کی صورت میں ریاست قلات کو آزادی مل جائے۔ ایک بلوچی قومی جمہوری مملکت وجود میں آئے۔ والد صاحب نے میر غوث بخش بزنجو کو واپس علی گڑھ جانے نہیں دیا انہیں مکمل طور پر ریاستی سیاست میں شامل کرلیا۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ میر غوث بخش بزنجو کی والدہ اپنی بہت ساری

کنیزوں کے ساتھ چھ مہینہ تک ہمارے گھر میں ٹھہری رہی تا کہ اپنے بیٹے کو واپس لے جاسکیں۔

قلات پر فوج کشی

ریاست قلات کی آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں والد صاحب کی اس زمانے کے برصغیر کے چوٹی کے رہنماؤں پنڈت جواہر لعل نہرو، مہاتما گاندھی، علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا ابوالکلام آزاد سے براہ راست روابط قائم تھے۔ ان حضرات سے خطوط کا بھی تبادلہ رہتا تھا۔ بدقسمتی سے 1958ء میں جب ریاست قلات پر فوجی حملہ ہوا۔ 6 اکتوبر کو خان قلات گرفتار ہوئے۔ اور 17 اکتوبر کو مستونگ سے والد صاحب کو گرفتار کر کے شہر میں کرفیو لگا دیا۔ ہمارے گھر کے کونے کونے کی شام سے رات تک تلاشی لی گئی کارروائی کا انچارج کرنل جھنجلاہٹ میں گالیاں بکتا اور بار بار کہتا۔ بتاؤ اسلحہ کدھر ہے۔ ہمیں سی آئی ڈی نے رپورٹ دی تھی کہ پانچ سو مسلح علیحدگی پسند چھپے بیٹھے ہیں۔ یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا۔ ہماری آبائی تلوار اور لائسنس یافتہ رائفل تھی۔ صرف وہی برآمد کر سکے۔ اس تلاشی میں ہمارا سب سے قیمتی نقصان یہ ہوا کہ لائبریری سے برصغیر کے مشاہیر کے خطوط جو والد صاحب نے محفوظ کر رکھے تھے۔ جو بلوچستان اور آزادی ہند کے حوالے سے ایک مکمل قومی ریکارڈ تھا۔ یہ لوگ بوری میں بھر کر لے گئے۔ ڈیڑھ سال جیل کاٹنے کے بعد والد صاحب نے ان خطوط کے حصول کی بہت کوشش کی لیکن تمام کوشش رائیگاں گئیں۔ ہمیں وہ ریکارڈ پھر نہیں مل سکا۔ اسی دن مستونگ میں وڈیرہ نور محمد بنگلزئی اور سردار زمان محمد شہی کے گھر پر بھی چھاپہ پڑا تھا۔ لیکن دونوں حضرات گھر پر نہیں ملے۔

سکندر مرزا اور ریاست قلات

1958ء میں پاکستانی فوج کا ریاست پر حملہ دراصل جنرل اسکندر مرزا کی مکارانہ چال تھی۔ اس نے خان قلات کو مذاکرات میں جھانسہ دیا۔ کہ اگر آپ ریاست کی طرف سے کچھ شرشور کریں پریشر بڑھائیں تحریک چلائیں تو میں ریاست کی خودمختاری کا اعلان کر دونگا۔ خان

قلات اس کی باتوں میں آ گئے ۔انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ ہم بلوچستان کے مسئلہ کو ورلڈ کورٹ میں لے جائیں گے ۔والد صاحب ورلڈ کورٹ کیلئے کیس تیار کر رہے تھے ۔انہوں نے قلات میں اپنا الگ خیمہ لگایا تھا ۔دوسری طرف نواب نوروز خان زرکزئی کا کیمپ لگا تھا ۔جو آئندہ کی گوریلا جنگ کیلئے منصوبہ بندی کر رہے تھے ۔ایک صاحب نے والد صاحب سے کہا یہ کیسا تضاد ہے یا تو آپ کورٹ کا قانونی چارہ جوئی کا راستہ اختیار کریں یا آزادی کی مسلح جدوجہد کا تو والد صاحب نے جواب دیا وہ اپنا کام کرے میں اپنا کام کرونگا۔

جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ تقسیم ہند کا فارمولہ یہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان اور ہندو اکثریتی ہندوستان میں شامل ہوجائیں گے ۔لیکن ریاست قلات کا معاملہ اس سے جدا تھا ۔قلات کبھی ہندوستانی ریاست نہیں رہی اسے انگریزوں نے فتح نہیں کیا۔ یہ اور نیپال ایک معاہدے کے تحت انگریز سے ہمکاری کرتے تھے ۔یہ کبھی برصغیر کا حصہ نہیں رہا۔ اسی موقف کو آگے بڑھاتے ہوئے والد صاحب اور میر غوث بخش بزنجو و دیگر ساتھیوں نے دن رات محنت کی ۔اپنا کیس مضبوط بنیادوں پر تیار کیا ۔متعلقہ فریقوں سے ملاقاتیں کیں یادداشتیں بھیجیں۔

جب برصغیر کی آزادی کا اعلان ہوا تو ریاست قلات کی طرف سے وائسرائے ہند وزارتی کیمشن صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کو ٹیلی گرام بھیجے گئے اور اپنے اس موقف کا اعادہ کیا گیا۔

آخرکار ہمارے اس موقف کو تسلیم کرلیا گیا ۔1947ء میں فیصلہ ہوا ۔کہ قلات کو سابقہ معاہدوں کے تحت خود مختار مملکت قرار دیا گیا ۔جس کا دہلی سے ریڈیو پر اعلان بھی ہوا ۔11 اگست کو خان قلات نے باقاعدہ آزادی کا اعلان کردیا ۔اس معاہدہ پر نوابزادہ لیاقت علی خان اور قائداعظم نے دستخط کیے ۔

الحاق پاکستان کی مخالفت

لیکن 19 اگست کو تقسیم ہند کی آزادی کے بعد پاکستان نے ریاست کو الحاق پر مجبور کرنا شروع کر دیا جس کیلئے دباؤ بڑھایا گیا۔ خان قلات جو ایک شریف اور نیک آدمی تھے۔ وہ دباؤ میں آگئے لیکن والد صاحب بزنجو اور دیگر سیاسی افراد کے زور دینے پر ریاست کے ہر دو ایوانوں کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ دونوں ایوانوں نے پاکستان سے الحاق کو مسترد کر دیا۔ اور ریاست کو بطور آزاد بلوچ قومی ریاست برقرار رکھنے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حکومت پاکستان نے اپنی دباؤ کی پالیسی جاری رکھی۔ لالچ دھونس خوف اور مراعات سے کام لیا گیا۔ اس کے باوجود ایوان نے چند ماہ بعد دوبارہ اپنے اجلاس میں زیادہ سختی سے اپنے موقف کا اعادہ کیا۔ لیکن ادھر برٹش بلوچستان سے نواب مری مرحوم، نواب اکبر خان بگٹی، محمد اکبر بنجرانی اور نواب جوگیزئی نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

دوسری طرف ریاست کے دوسرے علاقے ریاست لسبیلہ، خاران، مکران نے بھی الگ الگ پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ جس سے صورتحال اور بگڑ گئی۔ خان قلات پاکستان کی فوجی برتری سے بھی خاصے ڈر گئے تھے۔ اسی مقام پر والد صاحب بزنجو اور قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے خان قلات سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور یہ خان سے علیحدہ ہو گئے۔

خان کے بھائی آغا عبدالکریم نے مسلح قبائلیوں کے ساتھ بغاوت کر دی۔ اور پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ لیکن افغان گورنمنٹ کی عدم دلچسپی اور بے سروسامانی کی وجہ سے انہیں واپس آ کر سرنڈر کرنا پڑا والد صاحب غوث بخش بزنجو محمد حسین عنقا، ملک سعید دہوار عبدالواحد کرد سمیت سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ جہاں عقوبت خانوں میں انہیں بدترین اذیتیں دی گئیں۔

پاکستان اور میر عبدالعزیز کرد

میر عبدالعزیز کرد اور غوث بخش بزنجو میں 1955ء میں جیل سے رہائی کے بعد اختلاف زیادہ واضح ہوئے۔ غوث بخش بزنجو نے "استمان گل" نامی جماعت جوائن کرلی۔ اور سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم عمل ہوگئے والد صاحب چوں کہ پاکستان کے دائرے کے اندر سیاست کرنے کے مخالف تھے۔ انہوں نے پاکستان کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس لئے بھی ان کے موقف میں نزدیکی پیدا نہ ہوسکی۔ دوسری اہم وجہ والد صاحب خالصتاً ایک جدید بلوچ قوم پرست جمہوری سیاست کے ترجمان تھے۔ جو جمہوری اقدار پر مبنی روشن فکر ترقی پسند آزاد ریاست کا قیام عمل میں لانا چاہتے تھے۔ وہ غوث بخش بزنجو سے کہتے تھے کہ ہمارا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے جو کبھی مارکسی افکار کو ہضم نہیں کرسکے گا۔ اس سے بلوچی سوسائٹی کی وحدت تقسیم ہوجائے گی۔ اور ہم نظریاتی گروہوں میں بٹ کر اختلاف کا شکار ہوجائیں گے۔ جبکہ میر غوث بخش بزنجو اپنی سیاست کی ابتداء سے ماسکو نواز نظریات کو آگے بڑھا رہے تھے۔ وہ بلوچ وطن کو سوشلسٹ مارکسٹ ریاست میں تبدیل کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے جب ایوب خان کے دور میں مغربی پاکستان کی اسمبلی کے الیکشن ہوئے اس وقت B-D ممبر ووٹ دیتے تھے۔ ایوب خان نے مسلم لیگ کی طرف سے سردار دودا خان زرکزئی کو ٹکٹ دیا۔ غوث بخش بزنجو، سردار عطاءاللہ مینگل اور خیر بخش مری والد صاحب کے پاس مستونگ آئے اور ان پر زور دیا۔ کہ آپ انکے مقابلے پر کھڑے ہوں۔ والد صاحب نے انہیں دوٹوک انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا جب میں پاکستان کو تسلیم نہیں کرتا۔ تو اس کے آئین کے تحت الیکشن لڑ کر اسمبلی میں کیوں جاؤں۔ بعد میں ملک کی دیگر قوم پرست چھوٹی پارٹیوں کا اشتراک کہ جس میں ولی خان، عبدالصمد خان، مولانا بھاشانی اور حمید جتوئی شامل تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے بنیاد رکھی گئی جو نیپ کہلائی نیپ کے تاسیس کے وقت بھی یہ زعماء تین دن تک والد صاحب کے پاس آتے رہے۔ کہ چوں کہ آپ بلوچستان میں جدید سیاست اور قومی بیداری کے بانیوں میں سے ہیں آپ بھی نیپ میں شامل ہوجائیں۔

لیکن والد صاحب اپنے سابقہ موقف پر ڈٹے رہے 58 اور 1965ء کی گرفتار اور رہائی سے ویسے بھی اب ان کی صحت اس قابل نہیں رہی تھی ۔ کہ وہ عملی سیاست میں سرگرم ہوتے آخر کار 15 اپریل 1969ء کو والد صاحب کا مستونگ میں انتقال ہوگیا۔ اور انہیں مستونگ عزیز آباد میں ہمارے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا ان کی موت کے ساتھ بلوچستان کے قوم پرست سیاست کا ایک روشن باب ختم ہوا۔ میرے بڑے بھائی تو گورنمنٹ سروس میں چلے گئے ۔ بلوچستان گورنمنٹ سے بحیثیت سیکرٹری ریٹائر ہوئے ہیں ۔ یوسف عزیز ایڈوکیٹ ہیں ۔ لیکن انہوں نے پریکٹس چھوڑی ہوئی ہے ۔ محمود عزیز، میں اور حامد عزیز سیاست میں وارد ہو گئے ۔ محمود عزیز جن کی سیاسی تربیت والد صاحب نے کی تھی ۔ واقعا منجھے ہوئے سیاست دان تھے ۔ انہوں نے نیپ جوائن کرلی ۔ اور بعد میں نیپ کے ٹکٹ پر سینیٹر بھی منتخب ہوئے ۔ انکا جواں سالی میں انتقال ہوگیا حیدرآباد ٹریبونل میں محمود عزیز اور حامد عزیز 73 سے 77 تک نیپ کی قیادت کے ساتھ مختلف جیلوں مچھ، سکھر اور حیدرآباد میں رہے بعض سیاسی رفقاء بعد کے ادوار میں میر غوث بخش بزنجو کی سیاسی ناکامی کی وجہ محمود عزیز کی ناگہانی موت کو قرار دیتے ہیں۔

جوانی اور سیاست میں کردار

جہاں تک میرے حالات کا سوال ہے ۔ میری ذہنی بلوغت اور سیاسی تربیت ایسے ماحول میں پروان چڑھ رہی تھی ۔ کہ جب ہمارا گھر بلوچستان کی سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ زیادہ تر وقت اہم سیاسی وقبائلی رہنماؤں کو کسی اہم ایشو پر بحث ومباحثہ کرتے دیکھا ۔ والد صاحب قلات کی آزادی کی تحریک میں مصروف تھے ۔ یہ بلوچ قوم پرستی کے عروج کا زمانہ تھا ۔ بلوچستان سے ہونے والی زیادتی کا سب سے زیادہ اثر جوانوں پر پڑا تھا ۔ کہ ہمارے وسائل، روزگار اور حقوق پر دوسرے قابض ہیں ۔ فرسٹریشن میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ جوانی کے بالکل نوخیز ایام میں جب میں نے کالج میں قدم رکھا ۔ اس وقت میں پکے بلوچ قوم پرست میں ڈھل چکا تھا ۔ جس پر تھوڑی سی قلعی سوشلزم کے نظریات کی بھی چڑھ چکی تھی ۔ اور آئندہ کے لئے انقلاب کی خوابیدہ

خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے جس راستے کا بھی انتخاب کیا۔ خلوص شعور اور ایمانداری سے اس راہ پر چلا۔ اور اسکا بھی درس میں نے اپنے والد سے سیکھا۔ انہوں نے اچھی عادات اور خصلتیں بڑی محنت سے ہمارے اندر پیدا کی تھیں انکا یہ کہنا تھا۔ کہ جس شعبے میں بھی جاؤ ،جس راہ کا بھی انتخاب کرو صداقت، امانت اور دیانت کو ملحوظ رکھنا۔ کالج میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے آغا سلیمان اور آغا سرور احمد زئی کے ساتھ انڈر گراؤنڈ تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد بلوچستان کی آزادی کی جدوجہد کرنا، نان لوکل لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانا تھا اور بلوچ طبقہ کو منظم کرنا تھا۔

بی ایس او کی تشکیل

جب میرا کوئٹہ کالج میں داخلہ ہوا۔ اس وقت بلوچوں کی کوئی متحدہ تنظیم نہیں تھی۔ چھوٹی چھوٹی تنظیمیں چاغی اسٹوڈنٹس، خاران اور ساروان اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے کام کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے بلوچ لیگ کے نام سے بھی ایک اسٹوڈنٹس تنظیم کام کرتی رہی تھی۔ جو ہمارے زمانے میں تقریباً غیر فعال ہو چکی تھی۔ میں نے خیر جان بلوچ حکیم لہڑی اور چند دوسرے دوست جنکا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ ان تمام تنظیموں کو یکجا کر کے "ورنا واننده گل" کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ لیکن والد صاحب نے اسکے نام پر اعتراض کیا کہ اسکے نام سے تعصب کی بو آتی ہے۔ اور اس نام میں محدودیت ہے اسلئے اسکا نام تبدیل کردو۔ اسی دوران بزن بزنجو اور ڈاکٹر حئی کا داخلہ کراچی میں ہوگیا۔ اور یہ لوگ کراچی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے (B.S.O) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے نام سے نیا پلیٹ فارم سردار عطاء اللہ مینگل کی سرپرستی میں تشکیل دیا۔ پہلے سیشن میں میں، خیر جان بزنجو، غلام رسول رئیسانی اور چند دیگر دوست بلوچستان سے گئے۔ بعد میں بی ایس او کا تنظیمی ڈھانچہ پورے بلوچستان کراچی اور سندھ تک پھیل گیا۔

بی ایس او نے نیپ کی مضبوطی اور اس کے اہداف و مقاصد کو آگے بڑھانے میں دن

رات محنت کی اس جدوجہد میں ہمارے بہت سے پیارے دوست مارے گئے۔ کچھ جلاوطن اور پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ کچھ ایسے دربدر ہوئے کہ آج تک نارمل نہیں ہو سکے۔ ویسے تو بہت سے خاص واقعات ہیں۔ کیونکہ ہم جس دور سے گزرے ہیں وہ بلوچستان کی تاریخ کا تلاطم خیز اور پر آشوب دور تھا۔ اس دور میں ہمارے بہت سے قیمتی ساتھی مارے گئے۔ کچھ کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی البتہ نیپ کے استحکام اور اسکے منشور و پیغام کو آگے بڑھانے میں بی ایس او کا خاص کردار ہے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے 68 سے لیکر 76 تک دن رات ایک کر دیئے تھے۔ اور میں نے جوانی کے دس بارہ سال بی ایس او اور نیپ کی نذر کر دیئے

ایک افسوس ناک واقعہ

ایک واقعہ پر میں اب بھی اللہ پاک سے معافی مانگتا ہوں۔ خصوصاً جب میں انسانی اور دینی نکتہ نگاہ سے سوچتا ہوں مجھے دکھ اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ 1968ء میں لاہور کالج میں پنجابی طلبہ نے بلوچ اور پشتون طلبہ کو مارا پیٹا جب ہمیں کوئٹہ اس واقعے کی خبر پہنچی تو میں نے لیڈ کرتے ہوئے لڑکوں کو جمع کیا اور یہاں پنجابی لڑکوں کو خوب مارا پیٹا گیا۔ رات کو آر سی اور ایف سی نے ہمارے ہاسٹل کا گھیراؤ کر لیا۔ اور رات بھر فائرنگ ہوتی رہی اسی فائرنگ میں پی ایس ایف سے تعلق رکھنے والا پشتون ساتھی ظریف خان بھی مارا گیا جس کے نام پر اب بھی ایک ہاسٹل کا نام ہے۔

انقلابی رجحان

ایک چیز جو مجھے بچپن سے اپنے اندر محسوس ہوتی تھی۔ وہ تھا مجھ میں پایا جانے والا فطری انقلابی رجحان تھا، میں فطری طور پر ایک انقلابی تھا۔ میرے اندر ایک طوفان جوش مارتا تھا۔ کہ میں غریبوں اور مظلوموں کی مدد کروں۔ ان کے حقوق کیلئے قیام کروں۔ محروم لوگوں کو حقوق ملیں انکی رسائی انصاف تک ہو۔ سرداری نظام کا خاتمہ ہو۔ یہاں کی سول سوسائٹی ڈیولپ (Develop) ہو۔ معاشرے میں ہر سطح کے استحصال کا خاتمہ ہو۔ یہاں سماجی عدل و انصاف پر

مبنی معاشرہ قائم ہو۔ معاشرے کے ان مصائب دکھ درد ناانصافیوں سے نجات دلانے کیلئے کہ میرے پاس کوئی پلیٹ فارم بجز سوشلزم کے اور کوئی نہیں تھا۔ اس زمانے میں بی ایس او کو بھی تیزی سے سوشلزم کی طرف دھکیلا گیا۔ ہم انتہائی خلوص سے سوشلزم اور مارکسزم پر مبنی کتابوں اور روسی لٹریچر کا مطالعہ کرتے کہ اسی میں ہمارے مظلوم عوام کی نجات کا راستہ ہے۔ اور شاید ہماری صدیوں کی محرومیوں کا خاتمہ بھی سوشلزم سے وابستگی میں ہے۔

سوشلسٹ انقلاب دراصل مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں سے پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں نہ صنعت تھی۔ اور نہ بڑا جاگیردارانہ نظام کہ جہاں سے یہ انقلابی طبقے جنم لیتے ہم نے اپنی سیاسی ضرورتوں پر سوشلزم کا تڑکہ لگا دیا تھا۔

میں دوستوں سے اکثر و بیشتر یہ ڈسکشن کرتا تھا کہ بلوچستان میں کیسے انقلاب برپا ہوگا۔ اس زمانے کے جتنے ہمارے بزرگ اور ساتھی غوث بخش بزنجو، نواب خیر بخش مری، شیر محمد مری، خیر بخش بزنجو اور ڈاکٹر حئی سے ان موضوعات پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ لیکن مجھے شافی اور اطمینان کنندہ جواب نہیں ملتا۔ سب سے بڑا تضاد یہ نظر آتا کہ ہم نے انقلابات کی تاریخ میں پڑھا ہے کہ انقلاب کی قیادت معاشرے کے محروم اور ستم رسیدہ طبقے کرتے ہیں۔ وہ طویل جدوجہد کے بعد استحصال گر قوتوں سے جنگ کر کے ان سے اپنے حقوق اور ریاست کو چھین لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں صورتحال بالکل الٹ تھی کہ وہ مفاد پرست طبقہ جو کہ ہر زمانے میں انقلابات کا راستہ روکتا ہے۔ یعنی ظالم و جابر نواب و سردار کہ جن کی خدمات کے صلے میں انہیں انگریز سامراج نے انہیں مختلف القابات و نوازشات اور معاشی خوشحالی سے نوازا تھا۔ جو اپنی قوموں پر فرعون بن کر مسلط تھے جو اپنے سماجی رویوں روزمرہ کی زندگی اور قوم کی حالت میں معمولی تبدیلی لانے کے روادار نہ تھے ۔ وہی ہمارے ہاں انقلاب کے داعی اور چیمپئن بنے ہوئے تھے۔

1970ء کے الیکشن کے سلسلے میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کوئٹہ تشریف لائے نواب اکبر خان بگٹی نے ان کی دعوت کی تھی جس میں ہم بھی مدعو تھے۔ اسلامی سوشلزم پر میری بھٹو مرحوم سے

ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔ جب میں نے پیپلز پارٹی کے تضادات اور انقلاب کے حوالے سے دوغلی پالیسی پر انہیں متوجہ کیا تو انہوں نے مجھ سے میری تنظیمی وابستگی پوچھی جب انہیں ہمارے بی ایس او کا معلوم ہوا تو کہا کہ آپ لوگ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔

قائدانہ صفات سے محروم انقلابی رہنما

نیپ اور بی ایس او کی یہ جدوجہد ابتداء سے انقلابی بنیادیں نہیں رکھتی تھی۔ محض مبہم جوئی نعرہ بازی کی حد تک یہ انقلاب کا نعرہ لگاتے تھے۔ ان میں انقلاب کی معمولی علامات تک نہیں پائی جاتی تھیں۔ ہر انقلاب میں ابتداء میں نظریاتی فکری بنیادوں پر کام کیا جاتا ہے۔ انقلابی کیڈر تیار ہوتا ہے جو عوام میں جا کر شعور و آگہی پیدا کرتا ہے۔ انہیں جدوجہد کیلئے آمادہ کرتا ہے خود انقلاب لانے والا انقلابی کیڈر بڑی عجیب وغریب صفات کا حامل ہوتا ہے جو اپنے Cause میں ڈوبا ہوا اور جسے اپنے ہدف سے عشق اور اپنے مشن کی کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔ جن کے وجود کے پیکر سے انکے مشن کی خوشبو آرہی ہوتی ہے۔ انکا سارا وجود انکے ہدف میں ڈوبا ہوتا ہے۔ جو سادگی جفاکشی، سربازی، ایثار، عشق وقربانی کا پیکر ہوتے ہیں۔ جو اپنے ہدف کے حصول کیلئے اپنے پورے وجود کو مٹا ڈالتے ہیں۔ عوام انکی انہی خصوصیات صداقت سچائی خلوص اور کردار سازی کی وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں اور ان پر جان چھڑکتے ہیں۔

ہمارے انقلابی ان میں سے کسی ایک صفت کے بھی حامل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے۔ جب مصائب ومشکلات کا شکار ہوئے۔ بجائے مستحکم اور باعزم ہونے کے پارہ پارہ ہوگئے۔ ایجنسیوں کے ہاتھوں بک گئے۔ معمولی نوکریوں اور مالی مراعات نے ان کے کس بل نکال دیئے

بی ایس او کا استحصال

نیپ نے بی ایس او کو اپنی سیاسی ضروریات کیلئے استعمال کیا۔ اور ابتک یہی کھیل اس مظلوم تنظیم کے ساتھ جاری ہے۔ جسکا نہ کوئی ہدف ہے نہ مقصد، نہ جدوجہد کی سمت متعین ہے اور

نہ نشان منزل، نہ نظریات ہیں، نہ فکری مطالعے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک مفاد پرست شخصیات کی پاکٹ آرگنائزیشن بنی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں سوشلسٹ بننا ایک فیشن تھا۔ جو شخص جتنی پرولتاریہ، بورژوا وغیرہ اور دیگر مارکسی اصطلاحات یاد کر لیتا۔ اپنی وضع قطع بگاڑ لیتا مذہب کو برا کہتا ملاؤں اور مذہبی شعائر کا مذاق اڑاتا وہ سب سے بڑا سوشلسٹ تصور کیا جاتا۔ اس زمانے میں کھلم کھلا خدا کے وجود کا انکار اور مذہبی شعائر کی توہین کی جاتی یہ سب اتنی دیدہ دلیری سے ہوتا تھا۔ کہ کسی شخص میں انہیں روکنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ یہی باتیں جب عوام تک پہنچتی تو عوام ان کا سمیک Cosmatic انقلابیوں کے دشمن بن جاتے اور وہ مزید ہم سے دور ہوتے جاتے۔ نیپ والوں کے اس رویہ کے باوجود میں چھپ کر نماز پابندی سے پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ میٹنگ کیلئے بزنجو صاحب کے گاؤں نال جانا پڑ گیا۔ نماز کے وقت میں خاموشی سے اٹھا۔ اور دو میل دور ایک آبی چشمہ تھا۔ وہاں تک پیدل گیا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی۔

سرکاری ملازمت اور سبکدوشی

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے۔ جب نیپ کی حکومت بنی انہوں نے مجھے لیبر ڈیپارٹمنٹ میں بطور لیبر سیکرٹری تعینات کیا۔ میں کچھ عرصے اس پوسٹ پر رہا۔ جب بھٹو نے 1973ء میں نیپ کی حکومت توڑی۔ اور نواب بگٹی کو گورنر لگایا۔ اس نے نیپ کے تمام بھرتی شدہ افراد کو نکال دیا۔ کچھ عرصے بعد جب خان قلات میر احمد یار خان کو گورنر لگایا۔ تو انہوں نے مجھے بحال کر دیا۔ لیکن سیاسی حالات اتنے ناگفتہ بہ تھے کہ میں نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن نہیں کی نیپ کی قیادت جب جیل چلی گئی۔ مجھ پر بھاری ذمہ داری پڑ گئی۔ ادھر بلوچستان میں حکومتی ایجنسیوں اور آرمی کا آپریشن بھی شروع تھا۔ میرا بھی وارنٹ گرفتاری نکلا ہوا تھا۔ میں روپوشی کی زندگی میں معاملات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ میرا کام اس زمانے میں جیل کی قیادت اور باہر کے لوگوں سے رابطہ نیپ کی مزاحمت کو ہر حال جاری رکھنا قیدیوں کو راشن پہنچانا روپوشی کی زندگی گزارنے والوں کو

جگہ کی فراہمی بی ایس او کے ساتھیوں سے رابطے میں رہتا تھا لیکن میری روپوشی زیادہ عرصے نہ چل سکی۔ ایک دفعہ کوئٹہ سے گرفتار کرلیا۔ کچھ عرصے جیل میں رہا پھر رہا ہوگیا۔

سوشلزم ایک زوال پذیر نظریہ

اصل میں میں تحقیقی طور پر اس نکتہ تک پہنچ چکا تھا۔ کہ سوشلزم ایک زوال پذیر نظریہ ہے ۔اور فکری وعلمی طور پر تضاد کا شکار ہے۔ اس میں اتنی جان نہیں کہ ہم اس بے جان نظریہ کو اپنے معاشرے میں کسی بڑی تبدیلی یا جدوجہد کی بنیاد بنا سکیں۔ مارکسی تھیوری یہ کہتی ہے کہ کائنات ہر لحہ تبدیل ہورہی ہے۔ اس میں تغیر برپا ہے۔ دو قوتوں Thesis اور Antithesis میں جنگ برپا ہے۔ جسے وہ جدلیاتی تصادم کا نام دیتے ہیں۔ اس تصادم کا نتیجہ Synthesis کی صورت میں نکلتا ہے۔ جو اصل اور نتیجہ کہلاتا ہے۔ جو عہد حاضر کی ضروریات اور تقاضہ ہے اسی جدلیاتی مادیت کے اصول کو وہ سماج، تاریخ اور اقتصاد پر منطبق کرتے ہیں۔ مارکس نے اسی اصول کے تحت پتھر کے دور سے انسانی تاریخ کو تدریجی تحلیل کرتے ہوئے اپنے زمانے کا حل سوشلزم کو قرار دیا تھا۔ کہ اس وقت معاشرے کے مسائل کا حل سوشلزم میں ہے۔ اس نے غالباً یہ بات 1885ء میں کی تھی۔ اور اسکے پیش نظر زارشاہی اور اسوقت کی یورپ کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی تھی ۔کیا مارکس کی تھیوری پیش کرنے کے بعد جدلیاتی تصادم رک گیا۔ تاریخ جامد ہوگئی۔ سماج آلات واوزار جمود کا شکار ہوگئے۔ معاشرتی وسماجی ارتقاء رک گیا۔ کیا یہ جدلیاتی تصادم تاریخ بشر کو صرف سوشلزم تک پہنچانے تک آیا تھا۔ اور مارکسزم کی آئیڈیل سطح تو دور کی بات ہے۔

دوسرے یہ کہ انسان بڑا عجیب وغریب واقع ہوا ہے۔ یہ بڑا متلون مزاج ہے۔ اسکی زندگی کی بے شمار جہتیں ہیں۔ اس کی زندگی کی ایک ضرورت یا بعد کو اسکی غرض تخلیق یا غایت اولی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کہ وہ ایک سماجی جانور ہے۔ اور صرف اسکی اقتصادی ضروریات پوری کردی جائیں۔ تو وہ مکمل ہوگیا۔ روس نے 75 سال کی مکمل گرفت، اختیار وقوت وسطوت کے ہوتے ہوئے اپنے معاشرے کی لیبارٹری میں اس سوشلسٹ انسان کی تعمیر کرنے کی کوشش کی کہ جس نے

مارکسزم کا ابھی مرحلہ طے کرنا تھا۔ کئی نسلیں اس تجربے کی نظر کردیں۔ جبکہ ہر 7 سال کے بعد ایک نسل جوان ہوتی ہے لیکن روسی نظریہ سازوں کو بجز ناکامی، نامرادی کے کچھ نہیں ملا۔ انہیں اندازہ ہوگیا کہ سوشلزم چند اقتصادی خوبیوں کے علاوہ ایک خلاف فطرت نظام ہے۔ جو انسانی معاشروں میں نہیں چل سکتا۔ جو محض سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل میں وجود میں آیا ہے۔

جیل میں اللہ سے راز و نیاز

مجھے سوچنے سمجھنے کا زیادہ وقت روپوشی اور جیل مین ملا میں اب تک ہونے والی جدوجہد، نفع ونقصان، قیادت کی خامیاں، آپس کے اختلافات، داخلی انتشار، نظریاتی خلا اور فکری خامیوں پر سوچتا اور آئندہ کے حوالے سے متفکر رہتا۔ خصوصاً مجھے صدمہ اس صورت میں زیادہ ہوتا۔ جب ہر چند روز بعد ایسی خبر آتی کہ ہمارا فلاں دوست ایجنسی کیلئے کام کررہا ہے۔ فلاں نیشنلسٹ رہنما حکومت سے مراعات حاصل کررہا ہے۔ اور در پردہ تحریک کو بیچ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ ذہن میں یہ سوالات زیادہ زیادہ قوت سے پیدا ہونے شروع ہوئے، کہ آیا ہماری جدوجہد کی سمت درست تھی۔ ہمارا ہدف اور منزل کیا تھی۔ آیا ہماری قیادت اس لائق تھی کہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکے۔ ان سب سوالات کے جوابات میرے پاس نہیں تھے اور میں سخت مایوسی کا شکار تھا۔ میں نے از سرنو اپنے سفر کا آغاز کرنے کا منصوبہ تشکیل دیا۔ میں اکثر رات کی تنہائی میں اللہ پاک سے خلوص نیت سے دعا مانگا کرتا۔ رات کو دیر گئے تک جاگتا۔ کبھی کبھی اللہ پاک سے راز و نیاز کرتے ہوئے۔ میرے اوپر گریہ کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ اور آنسوؤں کی لڑی جاری ہوجاتی۔ ان دعاؤں ومناجات کے مجھے جملے پورے طور پر تو یاد نہیں۔ البتہ جتنے یاد ہے میں آپ کو سنا دیتا ہوں

"پروردگار تو جانتا ہے میں تیرا ایک حقیر کمزور وناتواں بندہ ہوں۔ مجھے تیرے فضل وکرم لطف اور مدد کی شدید ضرورت ہے۔ تو مجھ پر اپنا لطف وکرم جاری فرما۔ اے اللہ پاک! تو جانتا ہے مجھے تیری ذات سے محبت ہے میں تجھ سے عشق کرتا ہوں تجھے ہر معاملے میں یاد کرتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ تیری طرف اخلاص سے قدم بڑھایا۔ تجھے یاد کیا کرتا تھا۔ تیرا نام زبان پر ورد کرتا

تھا۔اے میرے معبود! تو یہ بھی جانتا ہے۔ ہماری یہ ساری جدوجہد کسی مفاد یا نام ونمود کیلئے نہیں تھی ۔ بلکہ اپنی مظلوم ستم رسیدہ قوم کی حالت زار بدلنے ان کے حقوق کے حصول کے لئے تھی ۔ آج بلوچ قوم گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ تیری ہی ذات ہے جو ہمیں ان مشکل حالات سے نکال سکتی ہے۔تو ہمیں سچے راستے کی طرف ہدایت فرما میں حق وصداقت کا متلاشی ہوں ۔ مجھے حق وصداقت کے راستے کی طرف رہنمائی فرما۔ تجھے واسطہ اپنے حبیب کا ہمیں ہمارے نفسوں کے حوالے نہ کرنا ورنہ ہم تباہ وبرباد ہوجائیں گے۔ہم پر خصوصی نظر کرم کر"

تفہیم اسلام کی خواہش

میں پہلے اسلام کو اچھی طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ میں دینی کتب کے مطالعہ کا آغاز کیا۔ دوران مطالعہ میری نظر سے ایک حدیث گزری جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔"کسی جنگ کا موقعہ تھا۔آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ کی تیاری کیلئے مال واسباب جمع کررہے تھے۔ ہر شخص اپنی توفیق کے مطابق دے رہا تھا ایک مزدور پھٹے پرانے لباس میں آپ کے پاس آیا۔اور مٹھی بھر کھجور شرماتے ہوئے دیئے۔ کہ حضور یہ میری آج کی مزدوری کی اجرت ہے۔آپ نے وصول کرتے ہوئے کہا کہ تمام مال واسباب پر اسکی یہ ایک مٹھی کی بخشش بھاری ہے"۔اس حدیث نے میرے وجود پر پڑے ہوئے تمام مادی پردے ہٹا دیئے۔اور مجھے معنویات کی اصل گہرائی کا علم ہوا کہ تحریکیں یا انقلاب مادی وسائل سے نہیں چلتے بلکہ اس کے لئے خلوص ،ایمان اور یقین بنیادی مصادر قوت ہوتے ہیں ۔ یہی فرق ہے۔اسلامی تحریک اور مادی تحریک میں اسلامی تحریک میں اہمیت اور معیار ایمان خلوص اور کوالٹی جانچنے کیلئے تقویٰ وپرہیزگاری کو قرار دیا جاتا ہے۔جبکہ مادی تحریکوں میں مال ودولت ،اسٹیٹس Status طاقت ثروت غلبہ کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔

مطالعہ اور تحقیق سے میں اس نتیجہ تک پہنچا تھا کہ اصل راستہ کہ جسے ہم نے چھوڑا ہوا ہے ۔وہ یہی اسلام ہے اسلام میں دنیاوی اور دینی دونوں حوالے سے کامل معاشرے کا تصور موجود ہے۔

ہماری مشکلات کا حل بھی اسلامی طرز زندگی اور اسی کو وسیلہ انقلاب بنانے میں ہے۔ کیونکہ ہمارے عوام کے باطن میں رگ و پے میں اسلام رچا بسا ہے۔ وہ اسلام کی حقانیت اسکے ہر حکم پر دل و جان سے عمل پیرا ہونا فخر سمجھتے ہیں ہماری بدقسمتی رہی کہ ہم نے نیپ کی جدوجہد میں بدیسی افکار کو اپنے معاشرے میں انڈیلنے کی کوشش کی ہم نے فرضی انقلابی صنعتی مزدور کیلئے تو بہت زیادہ جدوجہد کی لیکن فطری انقلابی جو کہ سچائی، باطنی طہارت، حق، انصاف اور عدالت کیلئے بغیر کسی لالچ و غرض کے قربانی دینے کو تیار ہے۔ اسے اپنے سے دور رکھا۔ ہماری نیپ کی جدوجہد میں چھوٹی سطح کے کارکن زیادہ تر مخلص ہوتے تھے بالائی طبقہ کی نہ کوئی نظریاتی اساس تھی۔ نہ کسی آئیڈیالوجی پر یقین نہ کسی ایک موقف پر متفق تھے، نہ کسی ضابطے یا اصول کے پابند تھے، اور نہ ہی کسی ایک منزل کے ہمسفر۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں جیل کے اندر اختلافات رونما ہونا شروع ہو گئے۔ جب جیل سے باہر آئے تو ہر ایک کی منزل جدا تھی۔ راستے الگ تھے اور ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی

اسلام سے طاغوت کو خطرہ

اس زمانے میں ایک اور واقعہ کہ جس نے مجھ پر خاصا اثر ڈالا جسے ہمارے مستونگ کی بزرگ و سماجی شخصیت سید مرتضیٰ جعفری مرحوم نے سنایا کہ وہ ایک سفر کے سلسلے میں بولان میل کے ذریعہ کراچی جا رہے تھے انکے کمپارٹمنٹ میں ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر صاحب بھی سفر کر رہے تھے۔ بریگیڈیئر صاحب نے دوران گفتگو اپنا ذاتی واقعہ سنایا کہ میں پچاس کی دہائی میں بحیثیت کیپٹن فوجی ٹریننگ پر امریکہ گیا۔ ویک اینڈ پر میں اپنے کسی عزیز سے ملنے نیوجرسی جا رہا تھا۔ میرے سامنے والی نشست پر ایک اسی بیاسی سالہ بڈھا کھوسٹ امریکن مسلسل کسی ضخیم کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ میں اکیلے بوریت محسوس کر رہا تھا درمیان، میں میں نے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ وہ دراصل مجھے میکسیکن (Mexican) سمجھ رہا تھا۔ آخر تھک کر اس نے کتاب بند کرلی اور ہلکی پھلکی گپ شپ کا آغاز

ہوا۔ وہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر اور یہودی تھا۔ دوران گفتگو میں نے یورپ اور تیسری دنیا میں سوشلزم کے بڑھتے ہوئے اثرات پر تشویش کا اظہار کیا تو جواب میں امریکن بوڑھے نے میری تشویش کو مسترد کرتے ہوئے مجھے کہا کہ بیٹے میں نے سوشلزم اور دنیا کے دیگر نظاموں کا بغور مطالعہ کیا ہے میں آج اپنے زندگی بھر کے مطالعہ نچوڑ کے بعد جس نتیجے تک پہنچا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آئندہ دنیا کو اگر کسی نظام یا مکتب سے خطرہ ہے تو وہ اسلام ہے میں اس بات پر چونک گیا۔ میں نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے مسلمان ممالک کو پس ماندہ اور غریب قرار دیا تو اس نے کہا کہ بظاہر اس وقت دنیا میں اسلامی ممالک پسماندہ غریب، سیاسی و معاشرتی انتشار کا شکار ہیں۔ انکی ترقی کی شرح اور تعلیمی صورتحال بھی قابل قدر نہیں ہے لیکن اسلام اپنی متحرک اور فعال آئیڈیالوجی اور مکمل نظام حیات کی بنا پر آئندہ دنیا میں نظریاتی طور پر سب سے بڑی آئیڈیالوجی بن کر ابھرے گا۔ سوشلسٹ صرف انسان کے مادی پہلو کی بات کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسکے اثرات محدود ہیں اسلام دین اور دنیا دونوں زندگیوں کی کامیابی کی اپنے ماننے والوں کو ضمانت دیتا ہے۔ اور سب سے بڑا پہلو یہ کہ دنیا بھر میں تمام قوموں کا اپنی آئیڈیالوجی پر اتنا پختہ ایمان اور یقین نہیں۔ جتنا مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات اور قرآن کی سچائی پر ہے۔ اور یہی سب سے خطرناک پہلو ہے ۔ جب بھی مسلمان قرآنی معیارات کے مطابق نظام قائم کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔ اس نے کہا کہ آئندہ پچاس سال بعد دنیا کو حقیقی خطرہ اسلام اور انکی تہذیب سے ہوگا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں کہ آیا یورپ میں عیسائیت اس خلاء کو پورا نہیں کرسکتی؟ اس نے کہا کہ عیسائیت میں قطعاً اتنی جان نہیں کہ وہ اپنے ماننے والوں کو فکری وروحانی غذا پہنچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی معاشروں میں مذہب سے دوری اور شدید روحانی اضطراب پایا جاتا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی سچائی پر ایمان اور یقین ہے۔ کمزوری صرف انکی بے عملی میں ہے۔ اس واقعہ نے مجھ پر خاص اثر ڈالا اور میرا اعتقاد اسلام پر زیادہ گہرا اور پختہ ہوگیا۔

تبلیغی جماعت کے چھ نمبر

سب سے پہلے جس مذہبی گروہ سے میرا رابطہ ہوا وہ تبلیغی جماعت والے تھے پچھ اور مستونگ میں ان کی فعالیت خاصی تھی۔ انکی مرکزی شوریٰ کے رکن محمد رفیق صاحب کا تعلق بھی پچھ سے تھا۔ ان کا سیدھا سادھا ڈھانچہ اور ابتدائی طریقہ کار بھی مجھے پسند آیا کہ یہ لوگ اس مادی دور میں اپنے مقصد کیلئے وقت اور پیسہ صرف کرتے ہیں۔ ابتدائی نشستوں کے بعد میں مستونگ کی جماعت اور چند دوستوں کے ساتھ رائے ونڈ گیا۔ رائے ونڈ میں میری تبلیغی جماعت کے اکابرین سے مفصل نشستیں ہوتی رہیں میں نے انکے نظریات اہداف طریقہ کار تبلیغی دعوت اور کام کرنے کی روش کو سمجھنے کی کوشش کی ان کی باتوں کو غور سے سنتا اور ان پر غور کرنے کے بعد بھرپور عمل کرنے کی کوشش کرتا میری کوشش تھی کہ میں اپنے مکمل وجود کو ان کے بتائے ہوئے سنت طریقہ کے مطابق ڈھال لوں وہاں میں نے علماء کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق شرعی داڑھی بھی رکھ لی اور اپنی مکمل وضع قطع تبلیغی جماعت کی طرز پر ڈھال لی وہاں جن بزرگوں سے ملاقاتیں رہیں اور جن کے بیانات ہم نے سنے ان میں مولانا محمد عمر پالن پوری اور مولانا منظور احمد نعمانی (ان دونوں کا تعلق انڈیا سے تھا)۔ مولانا عبدالوہاب صاحب مولانا جمشید صاحب بھائی بلال صاحب اور مفتی زین العابدین قابل ذکر ہیں۔

رائے ونڈ سے میں نے تبلیغی جماعت کی مطبوعات خریدیں۔ خصوصاً میں نے مولانا منظور احمد نعمانی صاحب کی احادیث کے بارے میں چار جلدوں پر مبنی کتاب ''معارف الحدیث'' کے کئی سیٹ خریدے۔ اور قریبی دوستوں کو ہدیہ کیلئے وہاں بزرگوں نے زیادہ سوالات کرنے سے منع کیا۔ اور خاموشی سے عمل پر زیادہ زور دیا۔ وہاں سے مجھے چلے پر اعزام کر دیا گیا۔ ہمیں پہلے چلے پر بلوچستان کے پشتون علاقے لورالائی کی طرف بھیجا گیا تھا اس کے علاوہ چھوٹے بڑے اجتماعات سہ روزے شب جمعہ و دیگر لاتعداد پروگرام اٹینڈ کئے اس عرصے میں میرے غریب خانے میں کوئٹہ اور رائے ونڈ سے مرکزی بزرگ بھی تشریف لاتے رہے۔ اور وہی روایتی رٹے

رہنمائے ذھب پر چلنے کی نصیحت کر کے چلے جاتے۔اب مجھے ان کی محفلوں میں بوریت کا احساس ہونے لگا۔میرا وجود تو انکی محفل میں ہوتا۔ذہن کہیں اور ہوتا۔مجھے محسوس ہونے لگا کہ جس چیز کی تلاش میں،میں یہاں آیا ہوں وہ یہاں نہیں ہے۔ان کی کل تعلیمات عبادات واخلاقیات ذکرواذکار تک محدود ہیں۔زندگی کے دیگر تمام پہلو مکمل طور پر نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔جبکہ میں اسلام کو مکمل ضابطہ حیات سمجھ کر داخل ہوا تھا۔ان کے ارتقاء کا آخری کمال چھ نمبر ہے۔جس میں کلمہ،نماز،علم،اکرام مسلم،تصحیح نیت،اور تبلیغ دین شامل ہیں اور سارا دین اسی چھ نمبر کے گرد گھومتا ہے۔

اسلامی انقلاب اور عدل اجتماعی کے تصور سے عاری تبلیغ

باقی تمام زندگی قصہ کہانی کے انداز میں واقعات کی تکرار تک محدود ہے۔سوال و جواب کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔بس عبادی اور اخلاقی کتابوں وہ بھی مخصوص لابی کے مصنفین کو پڑھنے پر زور دیا جاتا۔آج کے انسان کی انفرادی واجتماعی مشکلات' عالم اسلام کی زبوں حالی' سامراجی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں،مسلم خون کی ارزانی ملک کے داخلی مسائل میڈیا کے بڑھتے ہوئے فساد کے علاوہ اسلام کی اجتماعی،اقتصادی،سیاسی معاشرتی،سماجی تہذیبی وعمرانی مسائل آرٹ کلچر ڈرامہ سے انہیں کوئی سروکار نہیں ایسا لگتا ہے کہ ان مسائل کے حوالے سے ان میں کوئی سوفٹ ویئر ہی نہیں پایا جاتا اسلامی انقلاب عدل اجتماعی کے نظام کے قیام کیلئے جدوجہد کا آغاز کا تو دور تک سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔جب ان امور پر میں نے آہستہ آہستہ سوالات کرنا شروع کئے تو جواب دیا جاتا کہ آپ ابھی مزید تبلیغ کو وقت دیں۔پھر یہ باتیں آپ کو سمجھ میں آئیں گی۔میں نے دو سال کے عرصے میں ایسے تبلیغی افراد سے بھی ملاقاتیں کیں کہ جن کی پوری عمر تبلیغ میں بیت گئی۔ جب ان سے سوال کئے جاتے تو وہ ان سے بھی زیادہ خشک نکلتے۔دوسرا بزرگوں کا جواب یہ ہوتا کہ ہمارے ذہن میں بھی اسلامی ریاست کا تصور موجود ہے۔جب تک ہماری مکمل تیاری نہ ہوجائے ہم ان دیگر اسلامی شعبوں پر توجہ نہیں دے سکتے۔میرا اعتراض ہوتا کہ حضرت تبلیغی جماعت کو بنے ہوئے ستر اسی سال ہوگئے ہیں۔اور اب تک ہمارے ملک میں ان کے کروڑوں

حامی موجود ہیں اور اجتماعات میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں آخر کب کس لمحہ آپ کی تحریک کا آغاز ہوگا۔ جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی مدینہ منورہ میں 313 افراد مسلمان ہوئے آپ نے کفرو طاغوت سے انقلابی جہاد و مبارزہ شروع کر دیا۔ اور انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ جبکہ ہمارے ملک میں کفار کا طاقتور میڈیا ایک باقاعدہ طے شدہ حکمت عملی کے تحت کفار کی ثقافت، مغربی و ہندی بے حیائی پر مبنی کلچر پھیلانے میں مصروف ہے۔ عوام کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ آخر کب ہمارے جہاد کا آغاز ہوگا۔ آپ تبلیغی فوج کو جس جدوجہد کیلئے تیار کر رہے ہیں۔ ان میں تو آپ نے اس حوالے سے لڑنے کی صلاحیت ہی نہیں پیدا کی۔ انکی تربیت فکر و نظریہ تو وہی قرون اولی کی ضروریات کے مطابق ہے۔ کیا آپ ایک ایسے باڈی بلڈر کو کسی مقابلہ کے میدان میں لے جانے کا تصور کر سکتے ہیں کہ جس نے صرف بازوؤں کی یا صرف ٹانگوں کی ورزش کی ہو۔ باقی جسم یوں ہی چھوڑ دیا ہو۔ یہ گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اب یہ لوگ مجھ سے کترانے لگے ہیں ایک دفعہ کشمیر، فلسطین میں مسلم قتل عام پر بات چھڑی میں نے انہیں مسلم دفاع کے حوالے سے اہم رکن جہاد کی طرف توجہ دلائی۔ تو جواب دیا گیا کہ ہم اپنے اخلاق و کردار سے تمام کافروں کو مسلمان کر لیں گے۔

اس عرصے میں میری تشنگی و بے قراری بڑھتی چلی گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا۔ جیسے میرا ارتقاء رک چکا ہے۔ میری روح مضطرب ہے۔ طبیعت میں عجیب بے سکونی و ہلچل اور ایک سوز و درد کی کیفیت طاری رہتی ہے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تبلیغی جماعت جمود و رکود کا نام ہے۔ ان کا تصور اسلام اذہان افکار اور عمل کو منجمد کر دینے والا ہے۔ یہاں متحرک فعال بیدار مجاہدانہ اجتماعی فکر رکھنے والے انسان کو عملی میدان سے خارج کر کے ایک خاص سانچے میں ڈھال کر نئے قسم کا دولہ شاہ کا چوہا بنا دیا جاتا ہے کہ جس سے اسکی سوچ، فکر، مبارزہ و جہاد اجتماعی، ملی و امت مسلمہ کا درد و سوز و ساز سب کا حق چھین لیا جاتا ہے اسے بے روح بے جان خشک عبادات و انفرادی مسائل میں الجھا دیا جاتا ہے۔ تبلیغی جماعت میں جانے سے پہلے میں جن تین چیزوں کی تلاش میں تھا وہ مجھے وہاں

نہیں مل سکیں یعنی روحانیت اجتماعیت اور انقلابیت البتہ تبلیغی جماعت سے مجھے ایک فائدہ ضرور ہوا ۔ مجھے رائے ونڈ میں ایک اچھا اور مخلص دوست مل گیا۔ یہ حافظ عبدالواحد شاہوانی صاحب تھے۔ جنکا تعلق مستونگ سے تھا۔ جو مولانا محمد صدیق شاہوانی مرحوم کے فرزند ہیں یہ میرے بی ایس او کی سیاست کے دوران جمعیت طلبائے اسلام مستونگ کے امیر ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی چلے کے سلسلے میں رائے ونڈ آئے ہوئے تھے۔ میرے بعد کے ادوار میں یہ بھی میرے ہمسفر رہے۔

آئیڈیل شخصیت کی تلاش

میرا تبلیغی جماعت کا سفر دو سالوں پر محیط رہا۔ 76 کے آخر سے شروع ہو کر 78 کے اختتام تک تقریباً اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ اب میں ایک ایسی روحانی شخصیت کی تلاش میں تھا جو مجھے روحانی سکون کی راہ دکھا سکے۔ کہ جسکے ذریعہ میں سیر وسلوک کی راہیں طے کر سکوں۔ جو تقویٰ و پرہیزگاری کا عملی نمونہ ہو کہ جس کو دیکھ کر رسول اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہو۔ جو ہمارے معاشرے کے انفرادی و اجتماعی مسائل ، محروموں ، مظلوموں ، بے سہارا انسانوں کے حقوق ان کی مشکلات دور کرنے اور معاشرے میں تبدیلی کی بات کرے۔ امت مسلمہ کا درد رکھتا ہو۔ جو معاشرے میں عدل وانصاف کے نظام کے قیام کی کوشش کرے۔

مجھے اکثر دوستوں اور بزرگوں نے مشورہ دیا کہ جب تک آپ تطہیر باطن واصلاح نفس کے مرحلے سے نہیں گزریں گے۔ آپ میں یہ بے چینی واضطراب باقی رہے گا۔ آپ کسی مرشد کامل کو تلاش کیجئے اور اسکے دست بیعت ہو جائیں۔ باقی تمام روحانی سفر وہ آپ کو اپنی نگرانی میں کرائے۔

اب ایک نئے سفر پر روانہ اور ایک نئی منزل کی تلاش شروع کر دی میں نے فیصلہ کیا کہ اب آنکھ بند کر کے کسی شخص کے پیچھے نہیں لگنا اور اس کی شخصیت سے متاثر نہیں ہونا۔ پہلے غور سے اسکی شخصیت حالات اور تصور اسلام کا تنقیدی جائزہ لینا ہے اسکے رہن سہن اور طرز عمل کو دیکھنا ہے پھر آگے بیعت کا مرحلہ طے کرنا ہے۔

روحانیت کی لبادے میں ریاکاری اور دورنگی

اس سلسلے میں بہت سے بزرگ حضرات سے ملاقاتیں رہیں ان کی نشستوں میں شرکت ذکر واذکار روحانیت کے طریقے دیکھے۔ اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں انکے تصورات کا جائزہ لیا۔ جن میں سے چند افراد کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ سولانا عبداللہ درخواستی پیر زین الدین آغا، مولانا اللہ یار چکڑالوی، کراچی کے سید زار حسین شاہ صاحب ان میں سے کچھ بزرگوں کے ساتھ چند دن قیام کرنے کا بھی موقع ملا۔ حالات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ لیکن مجھے میرے تصور اسلام کے مطابق مسیحا کہیں بھی نہیں ملا زیادہ تر افراد کو دین وروحانیت کے لبادے میں دنیاداری اور ریاکاری میں مبتلا پایا۔ جن کا طریقہ کار خشک اذکار، وظائف چلے ریاضت کروانا تھا۔ پھر ان لوگوں کے اندر بھی دو شخصیتیں بیک وقت موجود تھیں۔ غریبوں کے ساتھ الگ اور امیروں کے ساتھ الگ روپ غریبوں کا الگ لنگر امیروں کا الگ انکے مریدوں کے درمیان اٹھنے بیٹھنے کا خاص انداز، غیر ضروری علیت بگھارنا، مراقبے کی حالت میں چلے جانا، کشف وشہود کی باتیں سنکر مجھ کچھ ہی دنوں میں ان سے وحشت اور نفرت ہونے لگتی۔ اور یہ مجھے مظلوم انسانوں کے روحانی استحصال گر نظر آئے۔

مجھے مرشد کامل کی تلاش میں اب اتنی مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ میں ایک نشست میں اصل چھپی شخصیت کو پہچان جاتا کہ اس شخص کی اصلیت کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند مزیدار قسم کی باتیں بھی سامنے آئیں جن سے محظوظ بھی ہوا جاسکتا ہے۔ ایک بزرگ کے پاس حاضری دی۔ پہلے دین مکتب اور روحانیت کی بڑی گاڑھی قسم کی باتیں کیں۔ مسلمانوں کی حالت پر اپنی درد انگیزی کا بھی تذکرہ کیا۔ اخلاص وایمان پر بھی لیکچر دیا لیکن رات کو نشست خاص میں باتوں میں وہ قبیلہ پرستی اور اپنے سردار کی محاسن وخوبیوں میں رطب اللسان نظر آئے اور ساتھ ساتھ دیوبند فرقہ کے فضائل اور اسلام کے دیگر فرقوں کے نقائص پر بھرپور گفتگو ہوئی تو میں نے کہا کہ ان کے اندر بہ یک وقت دو وجود پرورش پا رہے ہیں۔ قبیلہ پرست اور دیوبند پرست، مجھے ان میں

مسلمان نظر نہیں آیا۔

مولوی صاحبان کی تنگ نظری

کوئٹہ کی ایک جامع مسجد کے خطیب کا سنا کہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ میں دوستوں کے ہمراہ جمعہ کی نماز ان کے پیچھے پڑھنے چلا گیا کہ نماز کے بعد نشست ہوگی۔ اس دن انہوں نے اپنے خطبے میں مولانا مودودی پر وہ کیچڑ اچھالی کہ الامان والحفیظ ،اور بنیاد اپنے ایک مقتدی کے خواب کو بنایا۔ کہ اس نے خواب میں مولانا کو عذاب کا شکار ہوتے دیکھا ہے۔ مجھے تو خطیب صاحب کی عقل پر شک گزرنے لگا۔ کہ جس میں اتنی بھی سمجھ بوجھ نہیں ہے کہ ایک فرد کے خواب کو بنیاد بنا کر فیصلے کر رہا ہے۔ اور عالم اسلام میں نفرت، انتشار میں اضافہ کر رہا ہے۔

اسی طرح ایک صاحب طریقت بزرگ کہ جن سے نئی نئی قربت ہوئی تھی۔ رمضان کے مہینے میں اپنے جمعہ کے خطبے میں حکومت پر برس رہے تھے کہ وہ جھٹ پٹ بارڈر پر چیمن لگا کر پنجاب سے آنے والے حفاظ کی آمد کو روکے کیونکہ رمضان کی تراویح میں اہل پنجاب کے آجانے سے ہمارے حفاظ کی مارکیٹ متاثر ہوتی ہے۔ پنجاب ہمارا اس شعبے میں بھی استحصال کر رہا ہے۔ ایک صاحب کمال کے پاس گئے وہ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے سب کے سامنے زور سے گلے کو کھنکارتے ہوئے مسجد میں تھوکا۔ میرا دل فوراً بدظن ہوگیا کہ جو شخص بنیادی اخلاقیات سے واقف نہیں وہ کیا روحانی راہیں طے کرائے گا۔ اب مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسلام تو ایک ہے لیکن مذہبی لوگوں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ اور ان میں ہر قدم پر اختلاف رائے موجود ہے۔

میں راتوں کو اکثر جب میرے دل پر ایک خاص اضطراب کی کیفیت ہوتی نماز تہجد میں گڑگڑا کر دعائیں مانگتا

"کہ پاک پروردگار میری مدد فرما، میری رہنمائی فرما میری حق وصداقت سچائی کی

طرف ہدایت کردے۔ میں ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہوں کہ جہاں سے مختلف راستے جاتے ہیں مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کون سا راستہ سیدھا تیری طرف جاتا ہے۔ تو اپنے لطف و کرم سے مجھے وہاں تک پہنچادے۔ میں اپنی ناتوانی سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا"۔ اکثر و بیشتر مجھ پر گریہ کی کیفیت طاری ہو جاتی دوسری چیز کہ جس سے مجھے سخت نفرت اور چڑ تھی وہ ان علماء کا فرقہ وارانہ ذہن تھا۔ جو بہت محدود پیمانے پر سوچتے اور دوسرے مکاتب فکر سے ہم آہنگی اور اتحاد و اتفاق کو بڑی مشکل سے ہضم کرتے۔ مجھ پر شاید سیکولر نیشلسٹ تنظیموں کا اثر تھا۔ یا والد صاحب کی کھلی اور صاف ستھری تربیت کا اثر کہ میں فرقہ واریت کی سطح سے بالاتر ہو کر اسلام کی ہمہ گیر انقلابی تحریک کے حوالے سے سوچتا اور میں تمام مکاتب فکر کی کتابیں پڑھنا لازمی سمجھتا تھا۔ تاکہ فکر میں وسعت پیدا ہو۔ اور حق و صداقت کی کوئی بات مجھ سے چھوٹ نہ جائے۔ میری نظر سے قرآن کی یہ آیت گزری جس نے میرے اس یقین کو اور زیادہ پختہ کیا

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئک الذین هداهم الله واولئک هم اولو الالباب

(آیت نمبر 39 سورہ زمر)

ترجمہ:۔ بس خوشخبری دو میرے ان بندوں کو جو سب باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے اچھی اور حق بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت پر اور صاحبان عقل ہیں

تیسرے یہ کہ میں کسی فرقہ کی تلاش میں نہیں تھا میں تو تحقیق اور ریسرچ سے اس صداقت تک پہنچ چکا تھا کہ اسلام ہی میں ہماری نجات پوشیدہ ہے اور ہمیں اسلام کی انقلابی تعلیمات کو معاشرے میں تبدیلی کا ذریعہ بنانا چاہیے اس لئے اتحاد بین المسلمین بہت ضروری ہے۔

افغانستان میں روسی فوجوں کا داخلہ

اپریل 1978ء میں افغانستان میں روسی فوجیں داخل ہو گئیں اور پاکستان کے بارڈر

پرسرخ انقلاب کی بگل بجنا شروع ہوگئی یہاں ترقی پسند افراد اپنے آپے میں پھولے نہ سمارہے تھے کہ اب پاکستان میں بھی سرخ انقلاب کا سویرا ہوگا۔ میں چونکہ مکمل طور پر مذہبی فکر اختیار کر چکا تھا۔ اور مجھے اسلام کی انقلابی تعلیمات کی سچائی کا یقین تھا۔ پرانے سرخ نیشنلسٹ دوستوں سے جب ملاقات ہوتی تو وہ میرا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ نادر جان آپ کس اسلامی انقلاب کی بات کرتے ہیں مذہب تو انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور آپ جس اسلام کی بات کرتے ہیں عملی طور پر اس وقت کس ملک میں موجود ہے۔ آپ 48 اسلامی ممالک میں کوئی ایک ملک ہمیں دکھا دیں کہ جہاں اسلامی انقلابی تعلیمات کے مطابق ایک فلاحی ریاست وجود رکھتی ہو۔ آپ ایک بھی اسلامی ملک میں اسلام کی بنیاد پر انقلاب نہیں برپا کر سکے۔ آپ مفروضہ کی طرف جا رہے ہیں جب کہ ہمارا سوشلسٹ انقلاب دنیا کے کئی ممالک میں عملاً موجود ہے میرا جواب یہ ہوتا کہ اس میں قصور ہم مسلمانوں کا ہے کہ اسلام جیسی متحرک اور فعال آئیڈیالوجی کے ہوتے ہوئے ہم نے مسلمان ممالک میں اسلامی انقلاب کے لئے صحیح خطوط پر جدوجہد نہیں کی بلکہ ہم یہاں ملوکیت کے سائے میں پلنے بڑھنے والے جمود کا شکار فقہی مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ اگر ہم اس جدوجہد کا دسواں حصہ بھی اسلامی انقلابی تحریک کے برپا کرنے میں صرف کرتے کہ جس قدر جدوجہد ترقی پسند تحریک نے سوشلزم جیسے بے جان نظریہ کے فروغ میں توانائی صرف کی ہوتی تو پاکستان میں کب کا اسلامی انقلاب آچکا ہوتا۔

ایران میں تحریک انقلاب

یہ جولائی 1978ء کا واقعہ ہے کہ ایران سے خبریں ملنا شروع ہوئی ہیں کہ وہاں شاہ کے خلاف عوامی انقلابی تحریک شروع ہو چکی ہے جلسے جلوس ہڑتالیں مظاہرے، تشدد خوف آنسو، خون مزاحمت اور جدوجہد تیز ہونے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں اس وقت ہمارے بلوچستان کے دو اہم پڑوسی ممالک میں زبردست خلفشار انقلابی وسیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ہم دوستوں

نے ان تبدیلیوں اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ روز رات کو بین الاقوامی ریڈیو اسٹیشن سنتے اور ہر واقعہ کا تجزیہ کرتے۔

افغانستان کے حوالے سے ہمارا ابتداء ہی سے یہ خیال تھا کہ یہ عوامی جمہوری انقلاب نہیں اس میں عوامی شرکت کا گراف 5 فیصد بھی نہیں بلکہ معاشرے کو ایک مختصر اور محدود طبقے نے سرخ فوج کی مدد سے فوجی کودتا برپا کی ہے عوام کی اکثریت نے اسے قبول نہیں کیا ہے یہ تبدیلی شدید خون ریزی کے بعد دو سپر پاورز کی محاذ آرائی کے گرم محاذ میں تبدیل ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد حالات نے ہماری رائے کو درست ثابت کیا۔

ایران میں اسلامی انقلاب

ایران کے حوالے سے ہماری ابتداء میں یہ رائے تھی کہ یہ ایران میں موجود جبر و گھٹن اور ساواک کے بے رحمانہ مظالم کیخلاف ایک عوامی ردعمل ہے جس کی پشت پر تودہ پارٹی ہے اور اس سے مذہبی عناصر بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں یہ کوئی منظم اور باہدف انقلابی حرکت نہیں اسے جلد یا بدیر شاہ ایران امریکہ کی مدد سے کچل دے گا۔ چند ہی مہینوں کے اندر ہمارے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے اور ایران کی تحریک انتہائی منظم عوامی انقلابی ریلے میں تبدیل ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ انقلابی لیڈر شپ کے بیانات اسلام کی انقلابی تعلیمات کی روشنی میں سامنے آنے لگے۔ اور دن بہ دن اس انقلابی تحریک نے پیشرفت کرتے ہوئے دانائی اور بصیرت سے علاقے میں عالمی سامراج کی سب سے بڑی فوج ایجنسیوں اور اسٹیبلشمنٹ کو شکست سے دوچار کر دیا۔ شاہ ایران کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔ انقلابیوں نے ایک ایک کر کے ریاستی اداروں ریڈیو، ٹیلی ویژن، پولیس اسٹیشن اور فوجی چھاؤنیوں پر باقاعدہ جنگ کر کے قبضہ کر لیا اور اسی عوامی قوت نے سامراجی ایجنٹوں اور عوامی سرمایہ کو لوٹنے والے استحصال گر عناصر کو چوراہوں پر عوامی عدالت لگا کر پھانسی دی ان لوگوں کے ناپاک وجود سے اپنی سرزمین کو پاک کیا۔ اور رفتہ رفتہ انقلابی قوت نے پورے ایران پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اب ایرانی انقلابیوں کے افکار و نظریات مختلف پالیسی بیانات نعروں کی

شکل میں سامنے آنا شروع ہوئے۔ ان کی خارجہ پالیسی کے نعرے سے ہم بہت زیادہ متاثر ہوئے اور حیرت زدہ بھی کہ یہ کس طرح ممکن العمل ہے وہ یہ نعرہ تھا۔ لاشرقیہ ولاغربیہ۔ جمہوریہ اسلامیہ۔

ہم نہ مشرق کے ساتھ ہیں نہ مغرب کے، ہم صرف مسلمان ہیں یہ نعرہ ہمارے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ عصر حاضر میں کسی بھی تیسری دنیا یا اسلامی ممالک کا امریکہ یا روس سے تصادم کی صورت میں دوسری مقابل سپر پاور سے وابستہ ہونا ضروری تھا۔ اور انقلاب ایران انتہائی پر از مصائب اور دور ابتلاء میں جس سختی سے اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی پر گامزن رہا۔ یہ عصر حاضر کی سیاست میں کسی معجزہ سے کم نہیں۔

ایران کا اسلامی انقلاب ابتدائی چند سال جس بحران سے دوچار رہا۔ اسکی عصر حاضر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ انقلاب کے فوراً بعد امریکی سامراج کے اکسانے پر لسانی قوتوں نے بغاوت کردی جن میں خصوصاً کردستان میں کرد، عراق سے متصل پانچ صوبوں میں عرب اور آذر بائیجان میں آذری، آزادی پسندوں نے اپنی علیحدگی کا اعلان کردیا۔ انقلاب کے مخالف داخلی گروہوں جیسے تودہ پارٹی مجاہدین خلق کے ذریعہ کاؤنٹر ریولیشن کرنے کی کوشش بنی صدر اور قطب زادہ جیسی پٹھو شخصیات کی خریداری، امریکہ کے پشت پناہ گروہ کی دہشت گردانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں انقلاب کی صف اول کی قیادت صدر، وزیر اعظم، اسمبلی کے اسپیکر اور 72 پارلیمانی ارکان کی بم کے دھماکوں میں شہادت، امریکی سفارتخانے پر انقلابی طلبہ کا قبضہ اور 80 کے قریب C.I.A کے اہلکاروں کو ڈیڑھ برس تک یرغمال بنائے رکھنا امریکہ کا اپنے یرغمالیوں کی بازیابی کیلئے ایران پر حملہ آور ہو جانا۔ اور مشن کی ناکامی کے باعث ناکام لوٹنا۔ امریکہ اور یورپی یونین کا ایران کا اقتصادی بائیکاٹ، تیل کی برآمد روکنے اور اثاثوں کے منجمد کرنے کا اقدام اور آخر میں عراق کے ذریعہ معاہدہ الجزائر کا ٹیلی ویژن پر پھاڑنا اور ایران پر حملہ آور ہونے کا اقدام کہ جس نے پانچ عرب صوبوں پر قبضہ کرلیا ایران کے انقلاب کے اوائل میں ہر پیش آنے والا واقعہ دوسرے سے زیادہ خطرناک دل کو دہلا دینے والا ہوتا تھا۔ عصر حاضر کی سیاست کی معمولی بصیرت

اور معروضی حقائق کو مدنظر رکھنے والا شخص یہی تجزیہ کرتا تھا۔ کہ ایرانی انقلاب اب گیا تب گیا۔ لیکن ہم مشاہدہ کرتے رہے کہ دونوں سپر طاقتوں اور انکے حاشیہ نشین عرب و مسلم ممالک کی ریشہ دوانیوں اور تمام تر منافقتوں کے باوجود ایرانی انقلابیوں نے جس بے جگری بے خوفی اور ایمانی جذبہ سے مقابلہ کیا اس سے انقلاب کی عظمت اسکی فکری ونظریاتی گہرائی عوامی شعور و بیداری کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا پھر انقلابی قیادت کی قابلیت کی سطح بیشتر ڈاکٹریٹ کی سطح کے پڑھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر شہید بہشتی، ڈاکٹر شہید علی شریعتی، ڈاکٹر شہید مصطفیٰ چمران ڈاکٹر شہید مفتح ڈاکٹر شہید جواد باہنر شہید مرتضیٰ مطہری سب کے سب بین الاقوامی سطح پر دنیاوی و دینوی علوم میں مہارت اور روشن فکر اور عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ یہ ساری باتیں ہمارے لئے حیران کن اور تعجب خیز تھیں کہ ہمارے پڑوس میں زیر زمین اتنی منظم گہری اور فکری طور پر بلند تحریک برپا رہی۔ اور ہمیں اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ ہم وہی اپنے معاشروں میں روس کی اگلی ہوئی فکری ابکائی کو اپنے معاشرے میں ٹھونس رہے تھے۔

اب ہماری اولین یہ خواہش یہ تھی کہ انقلابی مفکرین کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے اور اس انقلاب کی حقیقی ماہیت کو سمجھا جائے تا کہ اس انقلاب کی فکری وعلمی گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس سلسلے میں خانہ فرہنگ ایران کی لائبریری سے آیت اللہ شہید مطہری، ڈاکٹر علی شریعتی، ڈاکٹر شہید چمران اور آیت اللہ شہید باقر الصدر کی چند کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس سے ہمیں ایران اور اپنے ملک کی اسلامی تحریکوں وہاں کے مفکرین اور ہمارے مفکرین کی علمی فکری و ذہنی صلاحیتوں کا تقابلی جائزہ لینے کا موقع ملا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ ایران میں جتنا علمی کام ہوا ہے عالم اسلام کے دیگر علاقوں میں اسکا عشر عشیر بھی نہیں ہوا۔ ایرانی علماء اور مفکرین زیادہ گہری بصیرت کے حامل ہیں اور اتحاد بین المسلمین انکا سب سے بڑا ہدف ہے۔

ایران کے انقلاب نے ہم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ہمیں ایک نئی امید اور ولولہ سے سرشار کیا تھا۔ اب ہماری یہ خواہش تھی کہ پاکستان میں علماء و مفکرین کو اسکے پیغام سے

روشناس کرایا جائے اور یہاں مسلمانوں کے درمیان اتحاد بین المسلمین کو فروغ دیتے ہوئے انقلابی جدوجہد کو منظم کیا جائے۔

اس سلسلے میں سابقہ مذہبی احباب سے ملاقاتیں کیں ۔ انہیں انقلاب کی اہمیت سامراج کی سازشوں اور اتحاد امت کی ضرورت کا قائل کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن ان ملاقاتوں میں ہمیں جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ سب تھکے ہوئے کم شعور اور مردہ افراد ہیں بظاہر تو ہماری ہاں میں ہاں ملاتے ہیں لیکن عملی طور پر یہ کچھ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

دوسرے یہ دیکھنے میں آیا کہ ہمارے ہاں خصوصاً روایتی مدارس کے پڑھے ہوئے لوگ زیادہ تنگ نظر متعصب فرقہ پرست واقع ہوئے ہیں وہ اتنی بڑی انقلابی تبدیلی کے بعد بھی ایرانی انقلابی رائٹرز کو پڑھنے کو تیار نہیں بلکہ دنیا بھر میں ایرانی علماء کو جو میڈیا پروجیکشن مل رہی ہے ہر طرف امام خمینی اور انکی انقلابی ٹیم کے اقدامات پر تبصرہ کیا جارہا ہے۔ اس سے ہمارے علماء احساس کمتری اور حسد اور کینہ وبغض کا شکار ہو گئے ہیں ہم جب انہیں ایرانی علماء کی استعمار دشمن پالیسی ، انکی جدوجہد، عزم وایثار ، عدل اجتماعی کے قیام اور اتحاد بین المسلمین کا تذکرہ کرتے یہ فوراً جواب دیتے کہ آپ کی یہ ساری باتیں درست ہیں ۔ لیکن ہم ان کو قبول نہیں کر سکتے کیونکہ وہ شیعہ ہیں۔ انہیں ملک وملت اور عالم اسلام کی زبوں حالی سے کوئی غرض نہ تھی ۔ ان سب سے ہر فرد اپنے ذاتی ایجنڈے پر عمل پیرا تھا ۔ ادھر ایرانی علماء مسلم دنیا میں اتحاد واتفاق اخوت وحدت پر مسلسل زور دے رہے تھے ۔ انکے ادارے ہر جگہ وحدت اسلامی کے پروگرام اخوت کانفرنسیں سیمینارز منعقد کر رہے تھے ۔ رسائل وجرائد کا اجراء کیا تھا ۔ انہوں نے اپنے ملک میں بھی اس مسئلہ کو حل کر دیا تھا سامراجی طاقتیں پورے ایران میں اپنی تمام تر سازشوں کے باوجود سنی اکثریتی علاقوں میں بے چینی اور کوئی بڑا اپ سیٹ پیدا کرنے میں ناکام رہیں ۔ امام خمینی نے کیا خوب فرمایا کہ جو شیعہ سنی میں اختلاف پیدا کرے وہ نہ شیعہ ہے اور نہ سنی ، وہ استعمار کا ایجنٹ ہے۔

ادھر اپنے ملک میں نوجوانوں میں بیداری اور انقلاب کے بڑھتے ہوئے اثرات کو

دیکھتے ہوئے میں نے اپنے دوستوں کو سیاسی بصیرت کی روشنی میں پیش گوئی کردی تھی ۔ کہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ امریکی استعمار ضیاء الحق کے ساتھ مل کر اس ملک میں مستقبل قریب میں فرقہ واریت پھیلانے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہے ۔ اور چند سالوں میں ملت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا جائے گا ۔ انہیں مصنوعی اور غیر حقیقی مسائل میں الجھا کر ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا جائے گا ۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر اسلام محمود مصری جامعہ الاظہر مصر کی کتاب '' شیعہ سنی مسئلہ ایک بے حقیقت غوغہ '' نظر سے گزری ۔ ۔ جو انہوں نے 1982ء میں تحریر کی تھی ۔ اس کتاب میں انہوں نے مختلف اسلامی ممالک کے اپنے سفر کی روداد قلمبند کی تھی ۔ مقبوضہ فلسطین غزئی ویسٹ بینک کے اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں کہ مجھے ایرانی انقلاب سے جتنی شدید نفرت کا احساس اس علاقے میں ہوا ۔ اتنا عالم اسلام میں کسی دوسری جگہ پر محسوس نہیں ہوا ۔ خصوصاً شیعہ دشمن لٹریچر کی بھر مار تھی ۔ جس میں ایرانیوں کو '' راس المجوس '' کہا گیا تھا ۔

مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ جس علاقے پر سب سے زیادہ انقلابی اثرات پڑنے چاہئے تھے ۔ اور جو خود بدترین اسرائیل کی غلامی کا شکار ہیں ۔ وہاں اس نفرت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ۔ تھوڑی دیر وہاں کے ارباب نظر سے گفتگو کے بعد میں نتیجے پر پہنچا گیا کہ اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد چند مقامی وظیفہ خور ملاؤں کے ساتھ ملکر اہل تشیع کے خلاف فرقہ وارانہ موضوعات پر کتابیں لکھوا کر گھر گھر تقسیم کر رہی ہے ۔ جس سے سادہ لوح افراد میں انقلاب دشمنی پیدا ہو رہی ہے اور ہمارے اپنے ملک میں ایجنسیاں بہت تیزی سے اسی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کی تیاری کر رہی تھیں ۔ اسکے لئے وظیفہ خور تنگ نظر جنونی ملاؤں کی فہرست اور مطبوعہ تاسک کے حصول کی فزیبلٹی تیار ہو رہی تھی ۔

اس حوالے سے میرا تجزیہ درست ثابت ہونے لگا فرقہ پرستی پر پہلی کتاب جو میری نظر سے گزری اور جسے میرے بہت سے جاننے والوں نے بطور تبرک مجھے ہدیہ کیا ۔ وہ تبلیغی جماعت کی بزرگ ترین ہستی مولانا منظور احمد نعمانی کی تھی کہ جن سے مجھے تبلیغی جماعت کے دنوں سے قریبی

ارادت تھی ۔ آپ کا تعلق انڈیا سے تھا۔ اور کثیر تصانیف تھے ۔ اور اکثر پڑھے لکھے باشعور لوگوں کو تبلیغی جماعت کے بزرگان انہی کی کتابیں ریفر کرتے تھے ۔ میں نے بھی اس زمانے میں ان کی کتاب "معارف الحدیث" خرید کر کئی دوستوں کو ہدیہ کی تھی ان کی نئی کتاب کا نام "ایرانی انقلاب شیعت اور امام خمینی" تھا۔ اس میں وہی فلسطین میں موساد کا سا انداز اختیار کیا گیا تھا۔ مولانا مذکورہ کتاب کے مقدمے میں خود وجہ تالیف تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایران کے انقلاب سے تمام عالم اسلام خصوصاً برصغیر کے جوانوں میں تحریک اور مہم جوئی پیدا ہوئی ہے ۔ جوانوں میں جوش وخروش اور انقلابی جذبات کروٹیں لے رہے ہیں جس سے ہمیں خطرہ ہے کہ لوگ شیعت کی طرف راغب نہ ہو جائیں ۔ اس کیلئے 80 برس کی عمر میں اس انقلاب کے اثرات روکنے کی کوشش کی ہے اور شیعہ سنی تاریخی اختلاف کو چھیڑ کر مسلمانوں کے درمیان تفرقہ، دوری اور نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کتاب اتنی زیادہ تعداد میں اور دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ کر کے ہر گھر میں پڑھے لکھے افراد میں مفت تقسیم کی گئی ۔ اتفاق سے میرے جو کرم فرما کہ جو مجھے اس حوالے سے جانتے تھے ۔ کہ میں انقلابی ذہن رکھتا ہوں اور اتحاد بین المسلمین کا خواہاں ہوں انہوں نے مجھے بہت زیادہ کاپیاں بھیجیں اور ہر خیر خواہ کی یہ خواہش ہوتی کہ میں اس کتاب کو ضرور پڑھوں اس کتاب کے بعد تو گویا منظم طور پر فتنہ پرور فرقہ پرست مولویوں کی تیز رفتار تعلیمات کا آغاز ہو گیا جس کی پشت پناہی ہماری ایجنسیاں اور عرب ممالک سعودی عرب وغیرہ کے ڈالر کام کر رہے تھے ۔ اور خصوصاً ایران سے نزدیک ملحقہ سرحدی علاقوں میں جہاں آبادی بھی بہت کم اور جنہیں بنیادی انسانی ضروری سہولتیں بھی میسر نہیں جہاں پینے کے پانی اور بجلی اور روڈ کا نام نشان تک نہیں ہے ہاں بڑے بڑے مدارس مساجد دارلعلوم بننے شروع ہو گئے ۔ اور کوئٹہ سے گلگت اور کراچی سے پارہ چنار تک فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے جو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے ۔

جماعت اسلامی سے رفاقت

ہماری کوشش یہ تھی کہ یہاں انقلابی قوتوں کو استحصالی طبقات کے خلاف جدوجہد کیلئے آمادہ کیا جائے۔ان میں مشترک نکات پر ہم آہنگی پیدا کی جائے۔اور ایران کے انقلاب کی وجہ سے جو مسلم امہ میں جوش وخروش پیدا ہوا ہے۔انکی حرارت کو برقرار رکھا جائے۔اسلامی جماعتوں میں واحد پارٹی جماعت اسلامی باقی رہ گئی تھی جو انقلاب کی حمایت کرتی تھی۔انقلاب کے اوائل میں امیر جماعت مولانا مودودی نے انقلاب کی حمایت کی تھی۔ہم اسی انقلابی جذبے کے ساتھ جماعت میں شامل ہوئے۔

جماعت اسلامی سے ہماری رفاقت چار پانچ سالوں پر محیط ہے۔یہی وہ جماعت ہے کہ جس میں ہم نے زیادہ عرصہ گزارا۔اس میں شاید اس وقت کے امیر جماعت صوبہ بلوچستان مولانا عبدالحمید مینگل سے ذاتی قربت اور انکی محبت کا دخل ہے مولانا سے گھنٹوں مختلف اسلامی دتاریخی وسیاسی موضوعات پاکستان میں انقلاب کی صورتحال، اتحاد بین المسلمین سامراج کے خلاف جدوجہد عالمی انقلابی تحریکوں پر گفت وشنید رہتی جن میں کبھی امان اللہ کنرانی مولانا عبدالغفور بلوچ، مولانا عبدالعزیز، ڈاکٹر عطاء الرحمان بھی شامل رہتے۔اس سلسلے میں مجھے متعدد دفعہ اپنے دوستوں کے ہمراہ منصورہ بھی جانا پڑا۔

جہاں جماعت کی اعلیٰ قیادت میاں طفیل محمد قاضی حسین احمد سعید احمد گیلانی مولانا خلیل حامدی سے طویل نشستیں رہیں ان میں سے بہت سے بزرگ بعد میں میرے غریب خانے میں تشریف لاتے رہے۔روایتی علماء کی نسبت مجھے جماعت کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے اور کھلے ذہن کے لگے۔اور عقلی ومنطقی استدلال کو سمجھتے ہیں حالات حاضرہ سے بخوبی واقف ہیں انکا لٹریچر بھی زیادہ کھلے ذہن سے تحریر کردہ ہے موجودہ پرنٹ میڈیا پر بھی ان کا خاصا اثر ہے۔تنظیمی صلاحیت بھی بہتر ہے۔جماعت والوں نے مجھے ضلع بولان کا امیر مقرر کردیا۔مولانا عبدالحمید نے مجھے مولانا مودودی کی کتابیں بھجوائیں۔ایک دفعہ غلام علی کے ہاتھ دو بوریاں چھوٹے کتابچے بھجوائے جو

سب روسی سوشلزم کے خلاف تھے۔ میں نے جوبات شدت سے محسوس کی وہ یہ کہ روس کے خلاف تو لٹریچر کی بھرمار ہے لیکن امریکہ، یورپ اور اسرائیل کے خلاف کچھ نہیں جبکہ ہم روس سے زیادہ انسانیت کے استحصال کا ذمہ دار امریکہ و اسرائیل کو سمجھتے تھے۔ مولانا عبدالحمید سے میں نے اس بات کی شکایت کی۔ تو انہوں نے میرے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ہمارے پاس امریکہ کے خلاف مواد نہیں ہے دوسری اہمیت کی حامل بات جماعت کی انقلاب سے وابستگی تھی جب ہم منصورہ گئے۔ ہم نے وہاں ایک بھی استعمار دشمن شخصیت نہیں دیکھی۔ کسی بھی مقتدر شخصیت کی زبان پر انقلاب و تبدیلی، محروموں، ومظلوموں کی کی بات نہیں سنی اس پر میں نے احتجاج بھی کیا۔ اس پر جماعت اسلامی پنجاب کے امیر سید اسعد گیلانی نے مجھے علیحدہ کرتے ہوئے کہا کہ میر صاحب ہماری مجبوری ہے کہ ہم ایران کی مکمل حمایت نہیں کرسکتے۔ میں نے کہا ایسا کیوں ہے اور اس میں کیا قباحت ہے تو مولانا نے میرے کان میں قریب ہوتے ہوئے کہا کہ عرب سرمایہ (Petro Dollar) اگر ہم ایران کی مکمل حمایت کریں گے۔ تو عرب ممالک ناراض ہو جائیں گے اور ہماری امداد بند کردیں گے۔ تیسری اہم بات جو میں نے مشاہدہ کی کہ عالمی سامراجی قوتوں نے ایران کے انقلاب کے اثرات روکنے کیلئے فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز کردیا تھا۔ ملک کے طول و عرض میں کراچی سے لیکر پارہ چنار اور گلگت سے لے کر کوئٹہ تک جگہ جگہ منظم انداز میں مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات کرائے جارہے تھے۔ سیلابی انداز میں شیعوں کے خلاف منافرت پر مبنی لٹریچر کی تقسیم اور فسادات میں ہزار ہا بے گناہ افراد بھینٹ چڑھ گئے۔ جماعت والے باوجود اس سازش سے آگاہی رکھنے کے (اور اس زمانے میں تو یہ ضیاء الحق صاحب کی بی ٹیم بنے ہوئے تھے) انہوں نے مصلحت کوشی سے کام لینے اور عرب مالی امداد بند ہونے کی خوف سے مثبت قدم نہیں اٹھایا۔

چوتھے میں نے جماعت کی لیڈرشپ میں دوروئیے محسوس کیلئے اندر اور باہر سے فرق محسوس ہوا۔ قاضی حسین احمد جو اس زمانے میں جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ بلوچستان

کے دورے پر آئے تو مجھ میں میرے غریب خانہ میں بھی تشریف لائے دوران گفتگو انہوں نے ایران، کے اسلامی انقلاب کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے اس انقلاب کو عصر حاضر کا عظیم اسلامی انقلاب قرار دیا۔ دوسرے دن میں الفلاح ہاؤس میں قاضی صاحب سے ملنے گیا۔ کمرے سے ان کے پشتو میں خطاب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں کمرے کے باہر ٹھہر گیا۔ جوتوں سے اندازہ ہوا کہ افغانستان سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کا اجتماع ہے۔ میں داخل ہونے کے لئے جوتے اتار رہا تھا کہ کانوں میں آواز پڑی کہ ایران کا انقلاب ایک شیعہ انقلاب ہے اور وہ انقلاب کی مخالفت کر رہے تھے۔ مجھے یہ سن کر سخت صدمہ ہوا اور قاضی صاحب کے موقف میں یک لخت تبدیلی سے حیرت زدہ بھی تھا میں وہیں سے بغیر ملاقات کیئے واپس ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جماعت اسلامی میں بصیرت شعور و آگاہی کی موجودگی کے باوجود بے عملی، مصلحت کوشی، اصولوں اور نظریات پر مالی مفادات کا غالب آ جانا موجود ہے اور جب ایسی صورتحال سے کوئی فرد یا گروہ دو چار ہو جائے وہاں اصولوں پر سودے بازی، کردار کا زوال، موقف میں کمزوری، عزم و استقلال کا شکستہ ہو جانا اور اخلاقی اقدار کا زوال آ جاتا ہے۔ تجزیہ اور گہرے مشاہدے کے بعد ہم دوست اسی نکتہ پر پہنچے کہ جماعت اسلامی ایک منظم اسلامی جماعت ہے اور بس۔ 1985-86 تک جماعت سے تعلق وا وارت کی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ اور بظاہر جماعت سے مایوس ہو چکے تھے۔

ایران کا سفر

جہاں تک ایران جانے کا سوال ہے مجھے انقلاب کے بعد انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ایرانی حکومت کی طرف سے متعدد بار دعوت دی گئی۔ لیکن میرا موقف یہ رہا کہ جو قریبی مشاہدہ انفرادی سفر سے حاصل ہوتا ہے وہ حکومتی سطح پر حاصل نہ ہو پائے گا۔ میں وہاں عوام پر انقلاب کے اثرات انقلابی قیادت ادارے، علماء اور محرومین و مستضعفین کی حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ 1988ء کے وسط میں چند قریبی دوستوں کے ہمراہ ایران گیا۔ ساتھ ساتھ بچپن سے اسلام کے متعلق بنے ہوئے خیالات اور قرآن وسنت کے مطابق ہمارے ذہنوں میں موجود اسلامی

معاشرے کو تلاش کرتا تھا۔اور شاید ہمیں ایران میں اسلام کے تصورات کے تحت انسان کامل مل جائے۔جہاں ہماری روحانی پیاس بجھ سکے۔اور جدید ترین اسلامی معاشرے کیسے قائم ہوسکتا ہے اسکو دیکھنے کی بھی خواہش تھی۔

قم کی اسلامی یونیورسٹی

ایران میں ہم سب سے پہلے انقلاب وروحانیت کے مرکز قم گئے وہاں ہزاروں نوجوانوں کو جدید انداز میں تعلیم حاصل کرتے دیکھا۔قم کا شہر شاید مذہبی تعلیم کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز ہے جہاں کم وبیش ایک لاکھ سے زیادہ طلبہ علم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔جہاں دنیا بھر سے اسٹوڈنٹس پڑھنے آئے ہوئے تھے۔قرآن وحدیث عربی ادبیات کے ساتھ فلسفہ،کلام،منطق،سماجی علوم تاریخ،فقہ،عرفان،بین الاقوامی لینگویجز ہر شعبہ میں تخصص (Specialization) کی حد تک تعلیم دی جاتی ہے۔وہاں بڑے جید علماء سے جو کہ ریاستی امور میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ ملاقاتیں ہوئیں۔خصوصاً آیت اللہ جوادی آملی،آیت اللہ حسن زادہ آملی،چیف جسٹس آیت اللہ موسوی اردبیلی،آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی،استاد جعفر سبحانی اور آیت اللہ بہجت سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں۔جہاں ہم نے کھل کر موضوع کی مناسبت سے سوالات کیئے انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے جوابات دیئے۔

ہم نے وہاں علماء میں ریاستی امور میں دخل کے ساتھ علم وحکمت تدبر وتقویٰ،روشن فکری،جدید علوم سے آگاہی اور عالم اسلام کے لئے تڑپ اور انکے اتحاد کیلئے شدید خواہش محسوس کی۔وہ پاکستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ مسائل پر متوحش تھے۔اور ہمیں آگاہ کرتے ہوئے نصیحت کی کہ اس کے پیچھے عالمی سامراج ہے۔آپ پاکستان جاکر علماء کو بتائیں کہ اس کیخلاف متحد ہوکر جدوجہد کریں۔ہمیں وہاں تعصب،تنگ نظری،رجعت پسندی کا معمولی سا بھی شائبہ محسوس نہیں ہوا۔ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے گھر میں ہیں۔جب بھی اہلسنت کا ذکر آتا۔وہ برادران اہلسنت کہتے۔ہمیں اپنا ملک یاد آجاتا جہاں علماء،ایک دوسرے کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں

۔ وہاں سنی شیعہ مشترکہ نماز جماعت کی علماء تشویق کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ ایران آ کر اس حدیث کا عملی مصداق سمجھ میں آیا۔

العلماء ورثۃ الانبیاء۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

ان نشستوں میں خصوصاً مہر و محبت رواداری کی خوشبو اور مہک پھوٹتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ہم اس بات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے کہ کہیں ہماری خاطر داری میں لفاظی یا ڈپلومیٹک انداز تو اختیار نہیں کیا جارہا۔ لیکن ہمیں اس کا کہیں بھی معمولی سا شائبہ نظر نہیں آیا۔ میں پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ پاکستان میں جب ہم علماء کے پاس اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں جاتے تو ہمارے جذبات اور حمایت کے حصول کیلئے ہماری ہاں میں ہاں ملاتے۔ اور بڑھ چڑھ کر امت مسلمہ کے اتحاد پر زور دیتے۔ جیسے ہی ہم محفل سے رخصت ہوتے۔ امام خمینی یا شیعہ حضرات کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے۔ جس کی کبھی کبھار اطلاع وہاں موجود ہمارے دوست ہمیں پہنچاتے۔

اسلامی انقلاب کی فکری بنیاد

دوسری چیز جس نے ہمیں متاثر کیا وہاں علمی وفکری نظریاتی کام کی بہتات ہے۔ ہم نے تمام سفر میں یہ بات خصوصی طور پر محسوس کی کہ ایران میں انقلاب کے بعد علمی وفکری کام بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہر شہر گلی و کوچہ میں حتیٰ فٹ پاتوں پر بھی کتابوں کی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ جہاں ہزاروں نت نئے موضوعات پر کتابیں چھپ رہی ہیں صرف خاندان، معاشرہ، ماحول کی تربیت کے حوالے سے سینکڑوں کتابیں موجود تھیں لوگوں میں کتاب بینی کا شوق عروج پر دیکھا جس سے اندازہ ہوا۔ کہ یہاں علماء نے محض جذباتی نعرہ بازی یا لوگوں کے بڑھتے ہوئے مسائل کو **(Exploit)** کر کے انقلاب کیلئے تیار نہیں کیا۔ بلکہ اسکے پیچھے گہری علمی وفکری تحریک شامل تھی۔ جسکی جڑیں عوام کے ذہن و شعور کی جڑوں میں پیوستہ تھیں۔

انقلابی ایران کا ایک اور پہلو جس نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ وہ وہاں عوام کی انتہائی

جدید طرز کی زندگی اسلام کے حدود وقوانین کے دائرے میں بسر کرنے کا انداز تھا۔ وہاں میڈیا، ٹیلی ویژن، ریڈیو تھیٹرز آرٹ کلچر ہر شعبے میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ ٹیلی ویژن کے پانچ چینل رات دن مصروف ہیں۔ جن میں عالمی سطح کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ انکی فلم انڈسٹری میں انقلاب کے نظریاتی تناظر کے تحت معیاری فلمیں بنا رہی ہے۔ جس میں ان کی چند فلموں کو بین الاقوامی آسکر ایوارڈ مل چکے ہیں۔ پاکستان میں ہمارے علماء کی جدید وسائل زندگی اور ٹیکنالوجی کی تیزی سے ترقی کے حوالے سے جواب تک دقیانوسی قرون اولیٰ کے زمانے کی سوچ رہی ہے۔ اور ہمارا مذہبی انسان کا تصور تمام جدید سہولیات سے محروم ایک خاص ڈھب کی مسکین صورت میں سامنے آتا ہے۔ جو ہم جیسے کالج یونیورسٹی کے پڑھے لکھے افراد کو مشکل سے ہضم ہوتا ہے۔ انقلابی ایران میں ہم نے واقعاً علماء اور معاشرے کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ اور اسلام پر عمل کرتے دیکھا۔ اس سے ہمارے اس عقیدے میں مزید پختگی آ گئی کہ اسلام ہی عہد جدید کے معاشروں کے مسائل حل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

خواتین کا معاشرے میں کردار

خواتین کے حوالے سے بھی وہاں خاصی پیشرفت دیکھنے میں آئی۔ انقلابی ایران میں خواتین جتنی متحرک اور فعال ہیں۔ شاید اسکی مثال عالم اسلام کے کسی دوسرے ملک کے بارے میں نہیں دی جا سکتی۔ بیشتر اداروں میں عورتیں اسلامی دائرے میں کام کرتی ہوئیں نظر آئیں بلکہ کچھ اداروں میں تو خواتین کی تعداد 60 فیصد سے بھی زیادہ تھی۔ ایرانی عورت کے شرعی پردے کے تصور میں چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوتے ہیں البتہ قم اور مشہد میں کچھ زیادہ پردے میں شدت نظر آئی۔ میں نے ایرانی عورت کا اپنے معاشرے میں عورت کی حالت سے تقابلی جائزہ لیا تو مجھے اپنی خواتین کی سماجی و انسانی حقوق کے حوالے سے حالت بہت پست نظر آئی۔ ہماری خواتین کو اپنے اسلامی حقوق کے بارے میں کچھ شعور نہیں۔ جسکی وجہ سے اسکا استحصال ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی رجحان کی حامل عورت کا اتنا پسماندہ انداز ہے کہ اسے عہد حاضر کے جدید معاشرے سے

کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اسے سہما ہوا بنا دیتا ہے۔ جس سے عورت میں اعتماد کی کمی رہتی ہے۔

مختلف یونیورسٹیز اور کالجوں میں جانا ہوا اور شہداء کے گھرانوں سے ملاقاتیں رہیں۔ وہاں پورے ماحول میں ایک پاکیزگی اور معنویت کا احساس ہوا۔ نوجوانوں میں ولولہ، عزم، ہمت، انقلاب کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ موجزن پایا۔ ان ملاقاتوں سے ہمارے اس موقف میں پختگی آ گئی کہ جب تک معاشرے میں تقویٰ باطنی طہارت، اخلاق اور فکری بلندی اور روشن فکری پیدا نہیں ہو جاتی۔ معاشرے میں طہارت و پاکیزگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم انتہائی سرد راتوں میں برف باری میں رات کے تین بجے بھی مشاہدہ کرتے کہ خواتین بچوں سمیت نماز تہجد پڑھنے حرم جا رہی ہیں وہ کسی قسم کے خوف یا عدم تحفظ کا شکار نہیں۔ ہمارے ہاں دن کے اجالے میں خواتین اکیلے باہر نکلنے سے گھبراتی ہیں۔ جبکہ وہاں بسوں، بینکوں، ریلوے اسٹیشن میں خواتین و حضرات قریب قریب موجود ہیں لیکن ماحول میں اتنی پاکیزگی موجود ہے کہ غلط قسم کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔

اسکول اور کالجز میں کورس تربیتی اور فکری حوالے سے بنایا گیا ہے۔ جس سے نئی نسل کی تربیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہو رہی ہے۔ ایران میں تعلیم کی شرح ہمارے ہاں سے بہت زیادہ ہے۔ 80 سے 85 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں اور وہ مسلسل تعلیمی شرح میں اضافے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہر چند کہ امریکہ اور یورپ کی طرف سے مسلسل اقتصادی دباؤ کی وجہ سے اقتصادی مسائل ضرور ہیں۔ لیکن حکومت تعلیم اور صحت میں نمایاں رقم خرچ کرتی ہے۔ عوام کیلئے یوٹیلٹی سہولیات بجلی، گیس، پانی بہت سستے داموں فراہم کی گئی ہیں بنیادی ضروریات کی تمام چیزوں میں حکومت بہت زیادہ سبسڈی دیتی ہے۔ جس سے عوام پر مہنگائی کا بوجھ کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

انفرادی سطح پر بھی بسوں ٹرینوں، ہوٹلوں میں ایسے واقعات پیش آئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اخلاق میں واضح تبدیلی آ رہی ہے

تحقیق کا آغاز

وطن واپسی کے بعد کچھ عرصہ تک ایک سرشاری کی کیفیت رہی۔ انقلاب کے بعد ایران میں ہونے والی تبدیلیوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔لیکن ایک سوال جو مسلسل میرے ذہن میں کھٹکتا تھا کہ وہ کونسا جذبہ اور کونسی قوت تھی جس نے ایران کے نہتے عوام کو رضا شاہ پہلوی جیسے باسطوت حکمران کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اور عوام نے بادشاہ کو اقتدار سے الگ کر کے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ جس قدر اس موضوع پر غور کیا اور دوستوں کے ساتھ مباحث کیے ایک ہی بات سامنے آتی اور میں اسی نتیجے پر پہنچتا کہ یہ ایران کے عوام کے مکتب اور مذہب کا درس ہے جس کے باعث آج وہ آبرومند اور آزاد ہیں اور یہ قوت انہیں کربلا سے ملی ہے جس کے باعث انہوں نے اتنا بڑا انقلاب برپا کیا۔ اور اس سلسلے میں بانی انقلاب امام خمینی کا ایک قول بھی نظر سے گزرا کہ

''یہ سید الشہداء کا خون ہے کہ جو تمام ملتوں کے خون میں جوش و حرارت پیدا کرتا ہے کربلا کو زندہ رکھیئے اور حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے نام مبارک کو زندہ رکھیئے کہ ان کے زندہ رہنے سے اسلام زندہ رہے گا۔''

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ مجھے زمانہ طالب علمی سے ہی تاریخ کے مطالعہ کا شوق رہا ہے اور میں نے دیکھا کہ تاریخ کے ہر دور میں شیعہ عوام نے بادشاہت اور ملوکیت کے خلاف جدوجہد کی۔ اور انقلاب برپا کیے لیکن چند امور میں شیعہ حضرات کے حوالے سے ذہن میں چند شبہات بچپن سے تھے۔ جیسا کہ بعض صحابہ کرام کو نہ ماننا، اور قرآن پاک کی تحریف کا قائل ہونا اور محرم الحرام میں عزاداری کے مراسم میں ماتم کرنا وغیرہ یہ ایسی چیزیں تھیں کہ جن کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا تھا اور اس بارے میں ان کا صحیح عقیدہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

اہل تشیع میں مراسم عزاداری اور اس کا پس منظر

شیعہ حضرات ایام محرم میں امام حسینؑ اور انکے اصحابؓ کی قربانی کی یاد میں عزاداری کرتے ہیں۔ جس میں شہدائے کربلا کی یاد میں مجالس، ماتم اور جلوس وغیرہ نکالے جاتے ہیں۔ اور محرم میں ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں مصائب اہلبیت کو اتنا زیادہ دہرایا جاتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ واقعہ اسی سال رونما ہوا ہے ہمیں بچپن سے یہ بتایا گیا تھا کہ ان کی مجالس و محافل میں نہیں جانا چاہئے یہ لوگ ان محافل میں ہمارے بزرگوں پر تنقید کرتے ہیں روتے پیٹتے ہیں ماتم کرتے ہیں جو بدعت ہے۔ اس حوالے سے جب میں نے تحقیق کا آغاز کیا اور جب میں نے چند دوستوں کے ہمراہ مراسم عزاداری میں شرکت کی۔ تو میں عزاداری کا حقیقی فلسفہ اور اس کے انقلابی اثرات دیکھ کر حیران ہو گیا۔

یہ عزاداری اور اس کے جلوس اصل میں یزیدی آمریت سے لے کر آج تک تخت و تاج ظالم و جابر مطلق العنان ڈکٹیٹر شپ اور آمریت کے خلاف ہونے والے اس احتجاج کا تسلسل ہے ۔ جس نے آج ایک مذہبی رسم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب امام حسینؑ کی شہادت کے بعد دجلہ و فرات سے حلب تک پھیلے ہوئے جنگجو قبائل نے احتجاجی مزاحمت شروع کی تھی۔ اور ان کا مشہور نعرہ تھا یالثارات الحسین" اٹھو اور خون حسینؑ کا انتقام لو یہ تحریک واقعہ کربلا کے بعد عام چھوٹے بڑے شہروں میں پھیل گئی۔ خصوصاً جن شہروں سے اہلبیت کے اسیروں کا قافلہ دمشق لے جانے کیلئے گزرا وہ شہر انقلابی تحریک کے کیمپوں میں تبدیل ہو گئے جن میں موصل تکریت، کرۃ النعمان، سیور، حران حمص اور حلب خاص مراکز تھے۔

یزید کی افواج نے ان مجاہدین کو سختی سے کچلنے کی روش اپنائی۔ ان میں سے چار ہزار کے قریب مظاہرین نے امام حسینؑ کی قبر پر آ کر زوردار احتجاجی مظاہرہ کیا اور ماتم و گریہ و آہ و فغان کا وہ بازار گرم کیا کہ تاریخ میں اسے توابین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے قبر امام حسینؑ پر عہد کیا کہ ہم یزید سے امام کا بدلہ لیں گے۔ بعد میں یہ چار ہزار افراد اپنے گھروں کو واپس نہیں گئے

صحابی رسول حضرت سلیمان ابن صرد خزاعی اور ان کے ساتھی بڑی تعداد میں یزیدی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے بنو امیہ کی آمریت نے بہت سے قبائل کو جبراً حلب کی طرف دھکیل دیا۔ جہاں انہوں نے امام کی عزاداری برپا کی۔ اور یزید کے خلاف جنگ کرنے کا عہد کیا۔ قدیم بلوچی منظومات خصوصاً بلوچی حسب نسب کی نظم کردگال نامک اور قاضی گنجاوی کے اشعار سے بھی ان واقعات کی صداقت کا پتہ چلتا ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد حامیان اہلبیت کے یہ قبائل ایک لحہ بھی چین سے نہیں بیٹھے یہ مسلسل حکومتوں کے خلاف شورش، مزاحمت اور قیام کرتے اور جابرائے زمانہ کے تخت وتاج کو چیلنج کرتے رہے اور اہلبیت کی حکومت کا مطالبہ کرتے رہے۔ جسکی وجہ سے انہیں دجلہ وفرات کے مرغزاروں سے متعدد بار ہجرتیں کرنی پڑیں۔ اور یہ انقلابی قبائل حلب سے ہجرتیں کرتے ہوئے کرمان، سیستان آگئے۔ یہاں بھی یہ شورش پسند اور ریاست کے مخالفین خیال کیے جاتے تھے۔ لوگ ان سے نفرت کرتے اور انہیں اچھا خیال نہیں کرتے تھے۔ یہ روش صدیوں سے جاری رہی۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد بنو عباس نے بھی ان حامیاں اہلبیت کے ساتھ ظلم وزیادتی کا رویہ برقرار رکھا۔ تاریخ لکھتی ہے کہ ایام محرم میں عاشورہ کے دن سادات اور ان کے حامی کالے کپڑے پہن کر اور مختلف احتجاجی پرچم اور بینرز اٹھائے اور کالے کپڑے پہنے ہوئے یا حسین یا حسین کہہ کر بازاروں میں احتجاجی جلوس نکالنے کی کوشش کرتے اور ظالم وجابر بادشاہان وقت ان کے اس عمل سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں ایسا کرنے سے روکنے اور مظلوموں کی حمایت میں نکالے جانے والے اس جلوس کو وہ اپنی آمریت کے خلاف ایک انقلابی تحریک خیال کرتے اور عام لوگوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے۔ علماء سے فتاویٰ جاری کرواتے کہ یہ دین دشمن تحریک ہے۔ ان کے قریب مت جاؤ۔ یہ اسلام کے خلاف ایک سازش ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر حکمران بنائے گئے ہیں۔ ہم زمین پر اللہ کے نائب، خلیفہ اور جانشین ہیں۔ اس لئے بلا چوں وچراں ہماری اطاعت کرو۔

اہلبیت کے حامی افراد کا یہ عاشورے کا احتجاجی مظاہرہ رفتہ رفتہ تمام عالم اسلام میں رائج ہوگیا۔ یہ غالباً دنیا کا واحد مکتب فکر ہے جو مظلوموں کی حمایت اور آمریت و بادشاہت وملوکیت کے خلاف مسلسل چودہ سو سال سے احتجاج میں مصروف ہے۔ جوایک عادلانہ حکومت کے قیام کی بات کرتا ہے۔ جو محروم اور پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی بات اور ان کے حقوق کیلئے آواز اٹھاتا ہے۔اور ہمیں عالم اسلام پر مسلط جابر بادشاہت کے خلاف اگر کوئی تاریخ میں حزب اختلاف نظر آتی ہے وہ یہی حسینوں کا مظلوم گروہ ہے جن سے نفرت کی جاتی رہی اور چودہ سو سالوں میں ہمیشہ ان کا قتل عام ہی ہوتا رہا ہے۔ان کا یہ احتجاج خلوص درد وسوز شجاعت اور ہدف کیلئے لازوال قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

امام حسین کی عزاداری کے اجتماعات رنج وغم ،خلوص ،درد ،سوز ،احتجاج ،شجاعت ،میں ڈوبے ہوتے ہیں ان میں شرکت سے ظالم اور ظلم سے نفرت، عظیم جوش وخروش ،افکار میں پاکیزگی اور مظلوموں کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ حکومتوں کی طرف سے لبنان، شام،عراق،سعودی عرب،ایران وغیرہ میں ان اجتماعات پر پابندی لگانے کی کوششیں ہوتی رہیں ۔لیکن یہی عزاداری تھی کہ جس نے دنیا کی سب سے قدیم اور مضبوط پہلوی بادشاہت کو اپنے ملک سے چلتا کردیا۔لبنان میں حسینیوں نے حزب اللہ کے پلیٹ فارم سے اسرائیل جیسی ناقابل شکست قوت کو ذلیل کر کے جنوبی لبنان میں شکست دی اور عراق میں بعث پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد سے شروع ہونے والی انقلابی جدوجہد میں لاکھوں افراد مارے جاچکے ہیں۔جبکہ دوسری طرف آپ دیکھیں چودہ سو سالوں سے اکثر سنی معاشرے بادشاہوں ، ڈکٹیٹروں اور آمروں کے قبضے میں چلے آرہے ہیں۔ جہاں کے حکمران زیادہ تر اپنی حکومت کی بقاء کیلئے استعماری قوتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور اپنے عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔عوام کے پاس چونکہ کربلا جیسا متحرک بیدار اور انقلابی پلیٹ فارم نہیں ہے۔اس وجہ سے ان ممالک میں عوام کی انقلابی جدوجہد کامیاب نہیں ہو پارہی۔اس کے مقابلے میں شیعہ معاشرے متحرک، بیدار انقلابی

روشن فکر اور عدل اجتماعی کیلئے زیادہ کوشاں نظر آتے ہیں اور یہ عزاداری ان میں استعمار سے مقابلہ کرنے کا لازوال جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

شیعہ حضرات اور تحریف قرآن کا نظریہ

قرآن مجید کے متعلق بھی یہی مشہور ہے کہ ان کا قرآن چالیس پاروں کا ہے اور دس سپارے بکری کھا گئی تو ایسی کوئی بات شیعہ حضرات میں نہیں دیکھی گئی بلکہ وہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ یہ قرآن پاک جو اس وقت عام مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں اس میں نہ ایک حرف زیادہ ہے نہ ایک حرف کم بلکہ اس کے تمام حروف تواتر سے ثابت ہیں۔ میں نے پاکستان اور ایران میں سینکڑوں مساجد امام بارگاہوں میں کلام مجید چیک کئے۔ کہیں بھی مجھے مختلف نسخہ نظر نہیں آیا۔ اور نہ چودہ سو برسوں میں آج تک کوئی ایسا دعویٰ نظر سے گزرا کہ اس نے شیعوں کا چالیس پاروں کا قرآن دیکھا ہے۔

انہوں نے بتایا کہ سورہ قیامت میں ارشاد خداوندی ہے کہ

ان علینا جمعہ وقرآنہ

ترجمہ:۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ جمع قرآن کے کام کو خداوند عالم نے امت پر نہیں چھوڑا رسول اللہ پر بھی نہیں چھوڑا بلکہ خود اپنے ذمہ لے لیا۔ اسی طرح حفاظت قرآن کے حوالے سے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ

اِنا نحن نزلنا الذکر وَاِنا لہ لحٰفِظُون

ترجمہ:۔ یہ ذکر تو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں۔ (سورہ حجر)

واِنہ لکتٰب عزیز ۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید

ترجمہ:۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ کتاب ہے۔

ایسی کتاب جس کے بارے میں اللہ خود اس بات کا دعویدار ہو کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا اور اس زبردست کتاب میں باطل نہ آگے سے آ سکتا ہے۔ نہ پیچھے سے میں تحریف کا عقیدہ رکھنا اللہ کے دعوے کو جھٹلانے کے مترادف ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ کہ شیعہ فقہا کے نزدیک نماز میں سورہ حمد کے بعد ایک کامل سورہ پڑھنا واجبات میں سے ہے۔ قرآن میں تحریف کا ہونا اگر مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز میں کبھی بھی سورہ حمد کے بعد ایک مکمل سورہ پڑھنا ممکن نہ ہوگا کیونکہ جو سورہ بھی پڑھا جائے گا اس میں نقص کا احتمال ہمیشہ باقی رہے گا اور نماز مشکوک ہو جائے گی۔

کہ اندیشہ کے خلفاء نے قرآن میں تحریف کی ہے۔ اس لئے بھی غلط ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو جن لوگوں نے حضرت عثمان کا گھیراؤ کیا تو انہوں نے حضرت عثمان پر اقربا پروری اور بیت المال میں خورد برد کے الزامات تو عائد کئے لیکن ان میں سے کسی نے بھی ان پر قرآن پاک میں تحریف اور کمی بیشی کرنے کا الزام نہیں لگایا۔ اگر حضرت عثمان نے آیات قرآنی میں کمی بیشی کی ہوتی تو یقیناً تحریف قرآن جیسا سنگین الزام اس گروہ کے الزامات کی فہرست میں سرفہرست ہوتا۔
اور یہ کہ ابتدائے اسلام سے آج تک مسلمانوں میں حفاظ قرآن موجود رہے ہیں جو ہمیشہ آیات وکلمات قرآن پاک پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایسے باکمال لوگ بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں جو قرآن مجید کے اعراب اور نقطوں تک سے واقفیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی قرآن پاک میں اتنی دلچسپی کی وجہ سے بھی اس میں تحریف کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔

جہاں تک تحریف کے سلسلے میں شیعہ کتب میں روایات کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سلسلے میں مجھے خود ہمارے سنی معتبر کتب بخاری ومسلم سمیت دیگر کتب حدیث میں بہت ساری روایات نظر سے گزریں۔ جو کہ تحریف قرآن کی طرف نشاندہی کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے علماء ان روایات

کوضعیف قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ حضرات کی کتب میں بھی ایسی روایات موجود ہیں کہ جنہیں شیعہ علماء ضعیف قرار دے کر مسترد کرتے ہیں۔

ان دلائل کے بعد میری تشفی ہوئی اور مجھے یہ یقین حاصل ہوگیا کہ شیعہ حضرات قرآن کو ایسے ہی مانتے ہیں جیسے باقی مسلمان مانتے ہیں۔

صحابہ کرام سے متعلق اہل تشیع کا نظریہ

کائنات میں جتنے بھی انقلاب آئے وہ کچھ ہی مدت میں انحراف کا شکار ہوتے ہوئے اپنے اصلی ہدف سے ہٹ گئے اور وقت کیساتھ ساتھ ان کی انقلابی روح معدوم ہوتی چلی گئی۔ اسی صدی کے اوائل میں برپا ہونیوالا روس کا انقلاب 70 سال بعد اپنی قوت قاہرہ اور آدھی دنیا کو اپنا ہمنوا بنا لینے کے باوجود زوال کا شکار ہوگیا۔ یقیناً اس انقلاب کے زوال کے پس منظر میں کچھ وجوہات اور عوامل ہوں گے۔ جن کے تجزیہ اور تحقیق کے بعد سوشلسٹ انقلاب کی ناکامی کے اسباب کا پتہ چل سکتا ہے اسی طرح نبی کریم کا لایا ہوا آخری الٰہی انقلاب جو کہ انسانیت کیلئے ایک مستقل دستور حیات کی حیثیت رکھتا ہے اور جسکا مقصد ایک آئیڈیل انسانی معاشرے کی تعمیر تھا۔ جس میں انسان انفرادی و اجتماعی حوالے سے اپنے کمال کو پہنچتا۔ یہ الٰہی انقلاب نبی کریمؐ کی وفات کے صرف اور صرف 35 سال بعد نبی کی مسند پر بندر اور سور نچانے والا یزید اپنی ماں بہنوں سے زنا کرنے اور برملا اسلامی شریعت کا مذاق اڑانے والا جو برملا کہتا تھا کہ نہ کوئی وحی آئی اور نہ فرشتہ آیا یہ بنی ہاشم کا ڈھونگ تھا نبی کریم کا وارث بن بیٹھا۔ جس نے نبی اکرم کا سارا گھرانہ کربلا میں ذبح کر ڈالا۔ اور ان کی ناموس کو کوچہ و بازار میں پھرایا اس کے بعد مدینۃ النبی پر حملہ کر کے ہزاروں صحابہ کرامؓ اور تابعین کو قتل کر دیا۔ اور مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے گئے۔ اور تین دن تک مسجد نبوی میں نماز قائم نہ ہونے دی گئی۔ اسی طرح مکہ مکرمہ پر حملہ کیا گیا۔ منجنیق سے پتھر اور آگ برسائی گئی جس سے خانہ کعبہ کے پردے کو آگ لگ گئی۔ یہ بادشاہت 90 برس تک تو بنی امیہ کے پاس رہی جبکہ بعد ازاں بنو عباس اور آل عثمان کی صورت میں اسلام کے مقدس نام پر امت مسلمہ پر

1922ء تک بادشاہت مسلط رہی۔

اب شیعوں کا قصور صرف اتنا بنتا ہے کہ وہ ان اسباب وعوامل کو تلاش کرنے کی بات کرتے ہیں جن کے باعث نبی اکرمؐ کا انقلاب اپنے اصل ہدف اور مقصد سے ہٹ کر ملوکیت کے ہاتھوں میں چلا گیا اور دنیا کو اپنے فیض سے سیراب نہ کرسکا۔ اور جب شیعہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف شخصیات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سنی بھائی انہیں ایسا کرنے سے روکتے ہیں کہ اس کی زد میں ہماری مقدس شخصیات نہ آجائیں۔ لیکن جب آپ حقائق کی تلاش پر زور دیں تو وہ فرار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اسے اجتہادی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور اسلام کی ابتدائی تاریخ پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین کے معرکوں اور صحابہ کرام کے باہمی جنگ وقتال کو دو حق پرستوں کا اجتہاد قرار دے کر غیر جانبدار تحقیقات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قتل ومقاتلہ کرنے والے دونوں گروہ حق پر تھے۔ اور قاتل ومقتول دونوں جنتی ہیں اگر ہم زیادہ گہرائی میں جائیں گے تو اس کی زد میں ہماری مقدس شخصیات آجائیں گی جس کی وجہ سے ہمارے ایمان میں نقص پیدا ہونے کا احتمال پیدا ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعوں کے سوالات آج تک قائم ہیں اس زمانے کی مفاد پرست سیاسی شخصیات کو زیر بحث لاتے ہیں مفاد پرست افراد پر تنقید کرتے ہیں کہ جو اپنے حب اقتدار کی وجہ سے اسلامی خلافت کے منصب پر قابض ہو گئے۔ اور جنہوں نے اسلام کو نقصان پہنچایا۔ ان سے نفرت کو شریعت میں تبرّیٰ کہتے ہیں۔ یہ ان سے دوری اختیار کرتے ہیں اور ان شخصیات کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اخلاص اور قربانیوں سے اسلامی روح کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ اسلامی شریعت میں تولا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شیعہ حضرات سب کے سب صحابہ کرام کو عادل نہیں مانتے اور نہ ہی معصوم مانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام میں مختلف درجات کے لوگ تھے اور مختلف ایمان کی کیفیات کے حامل تھے۔ صحابی کیلئے صرف یہ کافی نہیں کہ انہوں نے رسول اکرمؐ کو دیکھا اور دیکھتے ہی اب وہ تمام

فضائل وکمالات کے حامل ہو گئے ہیں بلکہ جس نے رسول اکرم کی صحبت سے فیض اٹھایا اور اپنی کامل تربیت کی تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کی اور وصال رسولؐ کے بعد ان کی تعلیمات پر باقی رہے۔ ان کا درجہ اور ہے۔ اور جنہوں نے نبی اکرم کی شریعت کو پامال کیا جہالت کے طور طریقوں کو زندہ کیا۔ اسلام کے نظام کو نقصان پہنچایا اور قیصر و کسریٰ کے طریقہ پر بادشاہت قائم کیا ان کا یہ اقدام کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ وہ افرادملت اسلامیہ کی نظروں میں قابل احترام ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح فتح مکہ کے وقت مجبوری کے عالم میں مسلمان ہونے والے کہ جو بعد میں اسلامی سلطنت کے وارث بنے۔ جنہوں نے بزرگ صحابہ کرامؓ کی توہین کی اور اسلامی قوانین کی دھجیاں بکھیر دیں اور شخصی آمریت مسلط کی اور اپنی استبدادی حکومت قائم رکھنے کیلئے اسلام کے مقدس تعلیمات کو استعمال کیا۔ اپنے اور اپنی حکومت کے بارے میں من مانی احادیث کے انبار لگوائے۔ اور من پسند دینی تشریحات کروائیں۔ وہ کسی طور مقدس کہے جانے کے مستحق نہیں۔

دوسرے یہ کہ عدالت صحابہ کے حوالے سے جو حدیث کلھم عدول'' کہ سب کے سب صحابہ عادل ہیں جس کی چاہے پیروی کی جائے یہ حدیث روایت و درایت کے معیار کے علاوہ اگر عقلی و منطقی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو بھی کمزور اور قانون فطرت کے بھی منافی ہیں۔ نبی اکرمؐ نے جس قوم کو بدترین جہالت اور تاریکیوں سے نکالا ہے۔ جسے خود بھی تربیت، تزکیہ اور حصول علم کے مراحل سے گزرنا ہے۔ جو ابھی نئی نئی دائرہ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ جس میں مختلف حیثیتوں کے لوگ ہیں جن میں بقول قرآن منافقین کی بھی بڑی تعداد شامل ہے۔

ومـمـن حـولـكـم مـن الاعـراب منافقون ومن اهل المدينه مردو على النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم (التوبه ١٠٢)

ترجمہ:۔ آپ کے چاروں طرف جو اعراب ہیں وہ منافق ہیں۔ مدینہ والوں میں سے بھی بعض نفاق پر جمے ہوئے ہیں۔ آپ بظاہر ان کو نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

اسی طرح سورہ منافقون، سورہ توبہ، جنگ احد اور جنگ حنین کے واقعات کو پڑھیں تو صورت حال زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ کیا نبی اکرمؐ جن لوگوں کو مسلمان کر رہے ہیں انہی سے کہیں گے کہ آپ سب عادل ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کے رہبر ہو گئے ہیں اور جو آپس میں ایک دوسرے کی پیروی کرے گا، بخشا جائے گا۔ سب کے سب معصوم عن الخطا بن جائیں گے۔ کسی غیر معصوم کو محفوظ عن الخطا سمجھنا جنت کا سرٹیفکیٹ دینا عقلی اصولوں کے بھی منافی ہے۔ جبکہ ہمیں قرآن مجید کی آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی سورتوں میں صحابہ کرام کی مختلف موقعوں پر سخت مذمت کی گئی ہے کہیں صحابہ کے جہاد سے انکار کی بناء پر مذمت کی گئی ہے۔ کبھی صحابہ کے بخل (انفاق سے انکار) کی مذمت کی گئی ہے۔ کہیں قرآن میں ایک فاسق صحابی ولید بن عقبہ کے فسق کی مذمت کی گئی ہے اور کبھی دوران نماز جمعہ کھیل تماشہ دیکھنے کیلئے چلے جانے کی مذمت کی جاتی ہے۔

اسی طرح تاریخ اسلام کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے آپس میں لڑائیاں لڑی ہیں۔ ایک دوسرے کو قتل کیا ہے۔ شراب پینے کے الزام میں کئی صحابہ کرام پر حدود جاری ہوئیں۔ کیا یہ تمام اعمال انجام دینے کے باوجود یہ سب معصوم ہیں اور سب کے سب مجتہد ہیں۔ اور جس کی بھی پیروی کی جائے جنت میں جایا جا سکتا ہے۔

شیعہ علماء نے مجھے بتایا کہ صحابہ کرام سے متعلق ہمارا عقیدہ اصولوں پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

جو رسول دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز آ جاؤ"

صحابہ کرام کو جانچنے کا پیمانہ بھی اتباع قرآن وسنت ہے۔ اعمال کے بغیر صرف رسول کو دیکھنے کی بناء پر صحابہ کو لائق پیروی قرار نہیں دیا جا سکتا، شیعہ حضرات صحابہ کرام کی زندگیاں اور ان کے اعمال و کردار اسی آیت کے تناظر میں پرکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے نبی کریم کی سنت کی سختی سے پیروی کی اسے بے چون وچرا قبول کیا وہ صحابہ انتہائی لائق احترام برگزیدہ اور جلیل القدر ہیں۔ لیکن جن اصحاب نے سنت نبی کو تاراج کیا۔ اپنی نفسانی خواہشات کیلئے لڑائیاں لڑیں، بے گناہوں

کو قتل کیا، اسلام کو نقصان پہنچایا وہ قابل مذمت ہیں۔ غالباً ایسے ہی لوگوں کے متعلق نبی کریمؐ نے فرمایا تھا۔

''اس روز میرے چند اصحاب کو بائیں جانب سے لے جایا جا رہا ہوگا تو میں کہوں گا یہ تو میرے اصحاب ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا آپ کے بعد یہ لوگ اپنے پچھلے دین (کفر) کی طرف لوٹ گئے'' [1]

یا اسی باب میں دوسری حدیث بھی ہے کہ

''میری امت کے چند لوگ پکڑ کر لائے جائیں گے میں کہوں گا پروردگار یہ تو میرے اصحاب ہیں رب فرمائیگا انہوں نے تیری وفات کے بعد طرح طرح کی نئی بدعتیں نکالی تھیں'' [2]

اسی طرح ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ

''میرے سامنے میری امت کے کچھ لوگ حوض پر اتریں گے یہاں تک کہ میں ان کو پہچان لوں گا۔ وہ میرے سامنے سے کھینچ کر لے جائے جائیں گے تو میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو اللہ فرمائے گا تم نہیں جانتے تمہارے بعد انہوں نے کیا کیا آپ نے فرمایا میرے بعض اصحاب ایسے ہیں جن کو مرنے کے بعد میں پھر نہیں دیکھوں گا۔ اور نہ وہ مجھے دیکھیں گے میں کہوں گا میرے اصحاب میرے اصحاب'' [3]

اس مطالعہ اور تحقیق کے بعد مجھے یہ یقین حاصل ہوگیا کہ شیعہ حضرات جو خود کو اہلبیت رسولؐ کا پیرو کہتے ہیں نہ تو قرآن پاک میں تحریف کے قائل ہیں اور نہ ہی یہ صحابہ کرام کے خلاف ہیں بلکہ یہ صحابیت کو قرآن کے معیار کے مطابق دیکھتے اور پرکھتے ہیں اور یہ ماتم مجالس اور سینہ زنی وہ انقلابی عمل ہے جس نے ان کے اندر حضرت امام حسینؑ عالیمقام کی تعلیمات یعنی حق پرستی اور باطل کے خلاف ڈٹ جانے جیسی خصوصیات کو زندہ رکھا ہوا ہے

۱۔ صحیح بخاری 2/264 باب تفسیر انبیاء ۲۔ صحیح مسلم 3/433 باب فضائل اثبات ۳۔ مسند احمد بن حنبل 6/ 312,307,299 جامع کنز العمال 11/252 کتاب الفتن استیعاب 2/397

عبدالوحید کلاچی، اوستہ محمد

دانشور ہمارے معاشرے کے حوالے سے ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں "حجاب معاصرت" اسکا مطلب یہ ہے کہ بہت سے افراد کی زندگی میں ان کی اصل عظمت صلاحیت اور تابنا کی معاشرے کے سامنے ظاہر نہیں ہو پاتی۔ انکے مرنے کے بعد ان پر سے پردہ ہٹتا ہے۔ لوگ ان کی شخصیت کی بلندی اور عظمت سے واقف ہوتے ہیں۔ میر نادر عزیز کرد بھی انہیں چند نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک تھے کہ جن کی افسوس ان کی زندگی میں قدر نہیں کی گئی۔ آج ان کے بلند افکار پاکیزہ خیالات، اخلاقی خوبیاں، توانا روح اور تقویٰ یاد آتا ہے تو ہمیں خون کے آنسو رلاتا ہے۔

میر صاحب سے میری پہلی ملاقات 1991ء میں ایک دوست کے طفیل ہوئی۔ پہلی ملاقات میں ان کی ملکوتی شخصیت کا دل پر گہرا اثر ہوا۔ عجیب مرد خدا تھا۔ آج تک اس ملاقات کی حدت روح میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ بلوچستان میں قافلہ عشق کے قافلہ سالار تھے۔

جس دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے ہمارا استقبال کیا۔ اس نے ہمیں ہمیشہ کیلئے اپنی محبت کا اسیر کرلیا۔ مجھے ان کی شخصیت میں جاذبیت سادگی اور بے ریائی نظر آئی۔ آپ ہماری باتیں بڑی غور سے سنتے رہے۔ اور خود گفتگو کا آغاز بڑے دھیمے اور شیریں لہجے میں کیا ایک ایک لفظ کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ تمام گفتگو مدلل اور منطقی تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد بے شمار ملاقاتیں رہیں۔ اور ہر ملاقات پہلے سے زیادہ پر تاثیر کہ دوبارہ ملنے کو دل چاہتا۔

سردیوں میں زیادہ تر آپ بچھ میں ہوتے ہم اوستہ محمد سے دوستوں کے ساتھ ملنے جاتے۔ کبھی کبھار تو ہمارے قیام کی مدت ہفتوں پر محیط رہتی۔ زیادہ تر دوست پہلی ملاقات کے بعد ان کے رسیا ہو جاتے۔ میر صاحب کی شخصیت بڑی باعظمت تھی۔ آپ کبھی بے مقصد گفتگو نہیں کرتے زیادہ تر انسانی سماج، تاریخ، انقلاب، سیاست، بلوچی قومی جدوجہد اور ہمارے بلوچ

معاشرے کے مسائل و مشکلات زیر بحث رہتے۔ چونکہ اسٹوڈنٹس لائف میں میرا تعلق بھی بی ایس او سے رہا ہے۔ میں ان سے اکثر بلوچ قومی جدوجہد کی شکست وریخت پر سوالات کیا کرتا۔ اس موضوع پر وہ خاصے حساس واقع ہوئے تھے۔ وہ حقائق کا گہرائی سے تجزیہ کرتے انہوں نے کبھی جانبداری یا شخصیت پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا وہ بلوچ تحریک کی شکست کا ذمہ دار سرداروں اور مفاد پرست ٹولے کو قرار دیتے تھے۔

میری جس زمانے میں ان سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ اس وقت تک وہ اپنی تحقیقی زندگی کا ارتقائی سفر تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ اور گہری تحقیق اور عمیق مطالعہ کے بعد مکتب اہلبیت قبول کیا تھا۔ گھنٹوں ان ہی موضوعات پر بات چیت رہتی۔ وہ ہمیں اپنی زندگی کے مختلف ادوار بچپن، بی ایس او کا زمانہ، نیپ کی قوم پرستانہ سیاست، تبلیغی جماعت، پیر پرستی، اور جماعت اسلامی سے لے کر اپنی آخری منزل مکتب اہلبیت تک کے واقعات سناتے۔ دوست اگر کوئی اعتراض بھی کرتے تو اسکا جواب خندہ پیشانی سے دیتے۔

وہ تقلیدی انداز پسند نہیں کرتے تھے اور ہمیں تحقیق اور مطالعہ کی روش اختیار کرنے پر تلقین کرتے۔ اکثر ایک جملہ فرماتے کہ ہماری ناقص معلومات اس بات کا جواز نہیں بن سکتیں کہ وہ حقیقت Exist ہی نہ کرتی ہو۔

میر صاحب کردار سازی اور اخلاقی خوبیوں کے پیدا کرنے پر بہت زور دیتے اگر کسی نوجوان میں کوئی اخلاقی کمزوری ہوتی تو بڑی خوبصورتی سے اسکی طرف توجہ دلاتے۔ آپ ریاکاری، دکھاوا، خود پرستی، اور جھوٹ سے نفرت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک تقریب میں ملک کی بڑی شخصیات مدعو تھیں۔ میر صاحب سادہ لباس میں بغیر بناوٹ کے وہاں چلے گئے۔ ایرانی کونسلیٹ اور دیگر سیاستدان انکی سادگی دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ ایک دفعہ میں نے مجھ میں ایک معزز شخص سے کنارا کشی کرنے پر وجہ دریافت کی تو کہا کہ اسکی محفل میں غیبت زیادہ ہوتی ہے۔ ہم جب بھی ان سے رخصت لیتے تو آپ مجھ کے اسٹیشن تک خود چھوڑنے آتے۔ ہمارے احباب

انکے بلند اخلاق اور روشن سیرت کی تعریف کرتے۔

1996ء میں وہ او دستہ محمد تشریف لائے۔ بہت سے دوست احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ آج تک ان نشستوں کی حلاوت اور میر صاحب کی بردباری اور تقوئی کا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وڈیرہ منظور لاشاری نے ان سے ملاقات کے فوراً بعد کہا تھا کہ آپ کم گو بامعرفت اور درویش منش انسان ہیں۔ میر صاحب کے سامنے غربت وامارت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ محروم اور پاپیادہ افراد کو دوست رکھتے تھے اور متکبر سرداروں سے انکے ظلم کی وجہ سے نفرت کرتے۔ آپ اکثر فرماتے کہ یہی غریب ومحروم افراد انقلاب کا ہراول دستہ بنیں گے۔ ایک دفعہ ان کے پاس ایک شخص انتہائی میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ملنے آیا۔ آپ نے اسے گلے لگایا۔ اور کافی دیر اسکے ساتھ محبت وشفقت سے گفتگو کرتے رہے۔ میر صاحب کا ظاہر وباطن ایک تھا۔ وہ مصنوعی انداز اختیار کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے تھے۔ انہیں ریاکاری سے شدید نفرت تھی۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی ان اخلاقی بیماریوں سے روکتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ ریاکاری باطنی شرک ہے۔ اللہ پاک اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ دوستوں سے کہتے کہ اپنا ظاہر وباطن ایک رکھو۔

میر صاحب کی شخصیت کا ایک اور توانا پہلو انکی للّٰہیت عرفانی ومعنوی پہلو ہے۔ جو تمام شخصیت پر حاوی نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں انکی یہی معنویت تھی کہ جس کی وجہ سے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ہم نے کبھی انہیں لمبی چوڑی عبادت کرتے نہیں دیکھا۔ بلکہ جتنی عبادت کرتے۔ خلوص اور عشق کے ساتھ کبھی کبھی راتوں کو تہجد کے وقت ہمارے پاس آجاتے۔ دعائیں اور مناجات پڑھتے گریہ کرتے۔ اللہ پاک کے حضور اتنے خلوص اور سوز سے دعا ومناجات فرماتے کہ پتھر دل بھی موم ہو جاتے۔ ہماری انفرادی استقامت، صبر وحوصلہ کی دعاؤں کے بعد عالم اسلام کی اصلاح اتحاد اور عالمی انقلابی تحریک کی کامیابی کیلئے دعائیں مانگتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب بھی عالم اسلام عقل شعور اور آگہی کے سفر پر گامزن ہوگا وہ اہلبیت کے انسانیت ساز

مکتب کی طرف ہی راغب ہوگا۔ جو عالمی انقلابی تحریک اور ظہور حضرت امام مہدی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر منتج ہوگا۔

میر صاحب نے اپنی زندگی ایسے خطوط پر ڈھال لی تھی۔ کہ انہوں نے مادی دنیا اور اسکی آسائشوں سے اپنے کو بالکل آزاد کرلیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک ہم پر مادی حجاب موجود ہے۔ ہم معنوی لذتوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ اکثر امام حسین علیہ السلام کی شخصیت آپ کی لازوال قربانی کا تذکرہ فرماتے اور گریہ کرتے۔ امام حسین کی محبت ایک شعلہ کی طرح ان کے وجود میں بھڑکتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے پورے وجود میں ایک تپش سوز و گداز برپا رہتا۔ وہ معاشرے میں ظلم وستم ناانصافی محرومی کے خلاف حسینی مشن کو پورا کرنے کے بارے میں بے قرار رہتے۔ ایک دفعہ نماز کے بعد مجھ سے فرمانے لگے کہ واقعہ کربلا کا تذکرہ کریں۔ میں نے امام حسین کی مظلومیت کے چند واقعات سنائے تو آپ بلند آواز میں گریہ کرنے لگے۔ آپ فرماتے تھے کہ امام حسین پر گریہ کرنے سے ایک باطنی نور پیدا ہوتا ہے۔ جو انسان کے قلب کی صفائی کے ساتھ ظلم وستم کے خلاف لڑنے کیلئے انسان میں عظیم جذبہ اور توانائی پیدا کرتا ہے۔ واقعاً میر صاحب کی روح عشق امام حسین سے سرشار تھی اور وہ عشق حسینی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مجالس امام حسین میں بھی آپ بلند آواز میں گریہ فرماتے تھے۔ آپ نوجوانوں کو کربلا شناسی پر زور دیتے اور انہیں حسینی انقلاب اور قیام کے اسباب و مقاصد سمجھاتے۔ اکثر فرماتے کہ افسوس دنیا نے امام حسین کو نہیں پہچانا۔ اگر آپ کی صحیح معرفت ہوتی تو پوری دنیا میں حسینی انقلاب برپا ہو چکا ہوتا ظالم صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہوتے۔

آپ فخر سے کہتے کہ ہم بلوچوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہم حسینی کاروان کے اولین مسافر ہیں، بلوچ حسینی فوج کے انقلابی طرفدار اور حسینی نمائندہ رہے ہیں ہمیں ہمیشہ امام حسین سے وابستگی کی وجہ سے تاریخ میں نفرت، تشدد، ظلم، جبر، ناانصافی اور مہاجرت کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام قدیم بلوچی تاریخ اور شاعری ہمارے اس موقف کی تائید کرتی ہے۔

امام حسین کی عزاداری کے متعلق انکا کہنا تھا کہ یہ ماتم اصل میں ظلم کی قوتوں کے خلاف سرخ انقلابی جدوجہد اور احتجاج کا نام ہے اگر ماتمی عزادار صحیح حسینی روح کے ساتھ اسے جاری رکھیں تو جابرائے زمانہ اور شرق وغرب کے استعمارگروں کو یہی ماتمی سیلاب طوفان بن کر بہالے جائے گا۔ وہ اسکی مثال شکاگو کے مزدور شہداء سے دیتے۔ کہ یکم مئی 1886 کو شکاگو کے مزدوروں نے قربانی دے کر مزدور تحریک کو زندہ کیا۔ اسی طرح امام حسین کی قربانی اور لازوال جدوجہد نے اسلام کو زندہ اور تابندہ کیا۔ جس سے اسلام کا بیمہ (Insurance) ہو گیا۔ اور حقیقی محمدی اسلام اور استعماری اسلام کے درمیان ہمیشہ کیلئے ایک خط فاصل کھنچ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی امام حسین کی قربانی کی یاد آج بھی بالکل تروتازہ محسوس ہوتی ہے۔ متعدد بار انہوں نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ ہمارے بچپن میں براہوی بیلٹ میں عاشورے کو ہر جگہ ماتم ہوتا تھا۔ ایک سازش کے تحت افغانستان کے علماء نے اسے بدعت کہہ کر بند کرایا۔ جسکی وجہ سے ہماری تمام عبادات عشق سوز محبت ومودت سے خالی خشک اور بے روح وبے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔

میر صاحب کی زندگی میں اخلاص کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ وہ ہر کام خدا کی خوشنودی کیلئے انجام دیتے۔ انکا کہنا تھا کہ ہمارا مشن خدا کی خوشنودی ہونا چاہئے۔ ہمارا انقلاب لانا ہماری سیاست ہماری معیشت اسکے بندوں کی خدمت ہمارا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا غرض سب کچھ اللہ رب العالمین کی خوشنودی اور رضا کیلئے ہونا چاہئے۔ تو اس لئے وہ نوجوانوں کو امام خمینی کی کتاب ''چہل حدیث'' کا اردو ترجمہ پڑھنے کی تاکید کرتے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ ہمارے ہاں مذہبی جماعتوں کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ جدوجہد کا آغاز خالص اور پاک عقیدے کے ساتھ نہیں کرتے۔ اس میں سیاسی مفادات حب اقتدار اور دکھاوا زیادہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے تھوڑے عرصے بعد ان کی جدوجہد پر شیطانی قوتوں کا قبضہ ہو جاتا ہے وہ عصر حاضر میں امام خمینی شہید مطہری، ڈاکٹر شریعتی ڈاکٹر شہید چمران ڈاکٹر شہید محمد علی نقوی سے بہت متاثر تھے۔

میر صاحب عمیق سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔ ہمارے گردو پیش میں ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں پر انکی گہری نظر تھی۔ اکثر وبیشتر وہ سیاسی حالات دیکھ کر پیش گوئی کرتے کچھ عرصے بعد بعینہ ویسا ہی ثابت ہوتا۔ ہم بڑے تعجب سے میر صاحب سے پوچھتے آپ کا کہنا تھا کہ ہر باشعور انقلابی عقل کامل کے ساتھ ایک باطنی نور بھی رکھتا ہے جو انکی حقائق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ میر صاحب کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو انکا انقلابی طرز عمل تھا آپ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتحال سے قطعاً مایوس تھے۔ اور بڑی شدت سے معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ آپ کا تجزیہ تھا کہ ہماری موجودہ سیاست انجینئرڈ ہے جسے ایجنسیاں، فوج، اسٹیبلشمنٹ کے ذریعہ ڈیزائن کرتی ہیں اور ہماری ایجنسیاں خود عالمی سامراجی طاقتوں کی ڈاکٹرائن پر عمل پیرا ہیں۔ ان لوگوں نے ہماری معیشت کو عالمی اقتصادی اداروں میں رہن رکھ دیا ہے جسکی وجہ سے ہماری آزادی خودداری استقلال سب مجروح ہو رہا ہے۔ میر صاحب ہمارے ان مسائل کا حل انقلاب میں قرار دیتے آپ چاہتے تھے کہ ایران کی طرز پر یہاں بھی انقلاب برپا ہو۔ وہ اکثر جوانوں کو پختہ عزم اور غیر متزلزل جدوجہد کی تلقین کرتے کہ تاریخ میں وہی قومیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے ہدف کے حصول کیلئے انتھک جدوجہد کی۔ وہ اس جدوجہد کی صورت میں پڑنے والے مصائب کو مشن کا حصہ گردانتے تھے۔ اور اکثر ایک حدیث سناتے کہ مومن وہ ہے جو چاروں طرف سے مصائب میں گرا ہوا ہو۔ انکی رائے تھی کہ اگر یہاں جوانوں کی فکری ونظریاتی تربیت کردی جائے۔ اوران میں شعور کے ساتھ حسینی روح پھونک دی جائے تو وہ دن دور نہیں کہ یہاں بھی ایک سچے اور حقیقی انقلاب کے برپا ہونے میں کوئی دیر لگے۔

میر صاحب مسلمانوں کہ بیشتر مسائل و مشکلات کا محور عالمی صیہونیت کو سمجھتے تھے۔ وہ تفصیل سے صیہونیت کی تاریخ، مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہتے کہ ایران کو چھوڑ کر تمام اسلامی ممالک کی سیاست، اقتصاد اور میڈیا عالمی صیہونی طاقتوں کے کنٹرول میں ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں لادین کلچر کے فروغ میں یہودی سرگرم عمل ہیں انہوں نے

عیسائیت کو بے دینی کی راہ پر لگا کر اپنا بے دام غلام بنا رکھا ہے ہمارے بیشتر اسلامی ممالک کے حکمران انہیں استعماری طاقتوں کے ایجنٹ ہیں جو عرصہ دراز سے اپنے معاشروں میں کفار کے ایجنڈوں کو آگے بڑھا رہے ہیں طالبان کے حوالے سے انکا کہنا تھا کہ یہ لوگ: ریخی بادشاہت اور ملوکیت کا تسلسل ہیں یہ کسی انقلابی جدوجہد کے نتیجہ میں نہیں آئے۔ بلکہ آئی ایس آئی نے اپنی ضروریات کیلئے انہیں (Develop) کیا ہے۔ یہ لوگ کم پڑھے لکھے جدید دور کے تقاضوں سے ناواقف، اسلام کی عدل اجتماعی پر مبنی انقلابی تعلیمات سے نا آشنا قدیم قرون۔ کے لوگ ہیں جنکے ہاں زیادہ زور اسلام کی تعزیری سزاؤں پر ہے۔ یہ لوگ عقل وشعور اور اجتہاد کے مخالف ہیں بصیرت کی اتنی کمی ہے کہ جدید میڈیا اور اسکولز تک کی مخالفت کرتے ہیں جنہوں نے خواتین کو معاشرے کا ایک غیر فعال حصہ بنایا ہوا ہے۔ ان کی اس روش کی وجہ سے اسلام کی مثبت کے بجائے منفی شکل سامنے آ رہی ہے۔ اسلام کی انقلابی تعلیمات بدنام ہو رہی ہیں اور صیہونیت اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ مغرب آج ان ہی کی بنیاد پر اسلام کو رجعت پسند دقیانوسی اور تشدد پسند قرار دے رہا ہے۔ تبلیغی جماعت کے متعلق میرے پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا کہ یہ لوگ ذہنی معذور ہیں یہ امت کا روحانی استحصال کر رہے ہیں اور ایک متحرک وفعال اور انقلابی امت کو بے عمل بنانے اور اسکی حرکی وجوہری صلاحیتوں کو زنگ آلود کرنے میں مصروف ہیں ان کا ظاہر بڑا سادہ اور دلکش لیکن باطن بڑا خوفناک ہے وہ فرماتے تھے کہ عالم کفر مسلمانوں میں شعور کی بیداری سے ڈرتا ہے۔ اسے مسلمانوں کی عبادات نماز روزہ حج وزکواۃ سے کوئی خطرہ نہیں میر صاحب ایک مثال بھی بیان کرتے کہ ایک دفعہ استعماری[1] فوجیں کسی مسلمان ملک میں قابض ہو کر داخل ہوئیں۔ عین اس وقت اذان کی آواز گونجی۔ فوجوں کا کمانڈنٹ گھبرا گیا پوچھنے لگا کہ یہ کیسا اعلان ہو رہا ہے۔ کچھ افراد نے جواب دیا کہ یہ مسلمانوں کی نماز کا وقت ہے مسلمان مسجد میں جمع ہوں گے اور نماز

---

[1] میر صاحب نے غالباً اسرائیل کا نام لیا تھا۔ جب اسکی فوجیں 1967ء میں بیت المقدس میں داخل ہوئیں تھیں مجھے پورے طور پر یاد نہیں آ رہا

پڑھ کر واپس چلے جائیں گے۔ اس نے کہا کہ ہمارے خلاف کوئی بات تو نہیں ہوگی جب اسے یقین دہانی کرادی گئی کہ آپ کے خلاف کسی قسم کی بات نہیں ہوگی تو اس نے اجازت دے دی کہ ایسے اعمال سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں بلکہ مسلمان زیادہ جوش وخروش سے یہ اعمال انجام دیں۔

میر صاحب اسلامی مکاتب فکر میں اتحاد ووحدت کے بڑے نقیب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان فرقوں میں اتحاد پیدا ہو جائے ایک دوسرے سے نزدیک ہوں، کھلے ذہن سے ایک دوسرے کی کتابوں کا مطالعہ کریں تا کہ تنگ نظری ختم ہو، وسعت نظر اور روشن فکری پیدا ہو، وہ موجودہ فرقہ واریت میں بیرونی عامل کے علاوہ اندرونی عامل جہالت اور ایک دوسرے کے مکاتب کے متعلق معلومات کی کمی اور تحقیقی روش کا نہ ہونا سمجھتے تھے۔ کہ جس سے استعماری گروہ فائدہ اٹھا کر انہیں باہم لڑا دیتا ہے۔ اس حوالے سے وہ ایرانی علماء سے انکی وسیع علمیت، روشن فکری اور تقویٰ سے بہت متاثر تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے تمام مکاتب فکر کا تحقیقی مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ اور تمام مکاتب فکر کی انہیں معلومات ہوتی ہیں۔ اہلبیت کے حوالے سے انکا کہنا تھا کہ یہ انسانوں کی بدبختی ہے کہ اتنے انقلابی اور عظیم گوہر نایاب مکتب کی موجودگی کے باوجود لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ شاید اسکی سب سے بڑی وجہ صدیوں پر محیط حکومتوں کا پھیلایا ہوا منفی پروپیگنڈہ ہے۔ ان حکومتوں کا اس پروپیگنڈہ سے مقصد یہ تھا کہ لوگ حقیقی اسلام سے قریب نہ ہو جائیں۔ اور ان ظالم وجابر حکومتوں کے تختے نہ الٹ دیئے جائیں میر صاحب کہتے تھے کہ یہ منفی پروپیگنڈا اتنا موثر تھا۔ کہ مجھ جیسا آزاد خیال عقل ومنطق پر یقین رکھنے والا بھی ان کے قریب جانے سے گھبراتا تھا میر صاحب کا اس سلسلے میں بہت بڑا کریڈٹ ہے کہ انہوں نے ہمیں تاریخ کے مطالعہ کی عادت اور تاریخی واقعات کا تجزیہ کرنا اور ہمیں انقلابی اسلام اور بادشاہوں کی گود میں پلنے والے استحصالی اسلام کے درمیان فرق سمجھایا کہ کس طرح مسلمانوں پر مسلط چودہ سوسالہ آمریت نے اسلام کی انقلابی روح کو مسخ کرتے ہوئے اسے بے روح بے جان بنا کر استعمار کی خدمت پر لگا دیا۔ جبکہ انقلابی اسلام دنیا بھر میں ظلم نا انصافی کے خلاف قیام کرنے اور عدل ومساوات کے تحت آزاد انسانی سماج تشکیل دینے کا درس دیتا ہے۔ آپ اکثر فرماتے تھے کہ دعا کرو کہ انسانی معاشرے میں عقلانی قوتوں کی حکمرانی قائم ہو جائے جب بھی انسانی سماج میں عقلی ومنطقی طرز فکر کی حکمرانی ہوگی۔ انسانیت مکتب اہل بیت کی طرف ہی رجوع کرے گی۔ وہ اسے ایک حریت پسند انسان ساز انقلابی مکتب قرار دیتے ہوئے اسے انسانیت روشن مستقبل سے تعبیر کرتے۔ اور پیشگوئی کرتے کہ اگلی صدی انشاء اللہ محروموں کمزوروں کی خائنوں اور متکبرین پر فتح کی صدی ہوگی۔

پُرنور انسان

عبدالوحید کلاچی

میں اسے کیونکر بھلاؤں

کہ جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا

چلا گیا

وہ چلا گیا ہمیشہ کے لئے

وہ ہمیں تنہائیوں کی آگ میں سلگتا چھوڑ کر چلا گیا

ہم سے دور، افق کے اس پار بہت دور

اس کی باتیں اس کے خیالات

اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو

میں بھلا دوں گا

اس جیسے لوگ اب کہاں اب تو ہر سو مکروفریب ریا، خود پسندی اور منافقت کے سیاہ اندھیرے پھیلے

ہوئے ہیں

زندگی خلوص کے بغیر گذر رہی ہے لوگ جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے

خواہش نے ہمارے وجود کو جکڑ رکھا ہے

مذہب، انسانیت سچائی کے وسیع دائرے کم ہوتے جا رہے ہیں

آج اگر کوئی خلوص سے پیش آئے تو یہ ایک معجزہ سے کم نہیں

ایثار جو کبھی ہمارا اثاثہ ہوتا تھا اب وہ مفادات کی بھینٹ چڑھ چکا ہے

دنیا کے جتنے بھی فلسفی، مفکر، دانشور اور تاریخ دان گذرے ہیں میرے خیال میں (West) پہ
ساری ایجادات اور اتنے بڑے فلسفے بلا ایثار و محبت اور خلوص نا ممکن تھے
تخلیقی کام آسان نہیں اسکے لئے ایثار و قربانی لازم ہے
وہ میرا بھائی میرا دوست جواب ہم میں نہیں
وہ ایثار و محبت نیکی کا سرچشمہ تھا
وہ چلا گیا وہ روشنیوں کا مسافر دوسروں کے دکھ بانٹنے والا
اندھیروں میں راستہ بتانے والا، ہاتھ پکڑ کر منزل بتانے والا
وہ پر نور انسان چلا گیا
اب میں اس کی یادوں کے سہارے زندگی کے دن گذار رہا ہوں
اذیت اور کرب بھرے دن گذار رہا ہوں

الہامی گفتگو

وہ جو کہتا تھا
پہلے خود عمل کرتا تھا
اس کے چہرے پہ مجھے بلا کا حسن نظر آتا تھا
استقامت، حوصلہ، دیانت
یہ اس کی زندگی کے
علامتی نشان تھے
مجھے تو اس کی باتوں سے خوشبو محسوس ہوتی تھی
وہ فکر و نظر اور عمل کے جادے پر
چلنے والا شخص تھا
اس نے جو مجھے بتایا اور آئندہ حالات کی گواہی دی
وہ حالات اب میرے سامنے ہیں
وہ پیغمبرانہ بصیرت رکھنے والی روح
اور سچائیوں کی زبان رکھنے والی شخصیت
اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہا
وہ چلا گیا
دور بہت دور
اس کا کام اس کی فکر اس کی سوچ
ہمارے لئے ایک اسوہ کا مقام رکھتی ہے
میرا بھائی ایسا ہی تھا

زندگی کے اداس ویرانوں میں
جب میں تھک کر حوصلہ ہار جاتا ہوں
تو اس کی الہامی گفتگو
مجھے حوصلہ دیتی ہے اور میری ہمت بڑھا کر
جینے کا نیا ڈھنگ عطا کرتی ہے

وہ ہم سے روٹھ کر چلا گیا

وہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے

عبدالوحید کلاچی

وہ کیا گئے

جیسے کائنات کی تمام محبتیں بانٹنے والا شخص چلا گیا ہو

وہ لمحوں کو قید کرنیوالا آدمی تھا

اس کے پاس بیٹھ کر

یوں لگتا تھا گویا وقت کا دریا رک گیا ہو

اس کا پرسوز لہجہ

اس کی شیریں گفتگو

یاد کے صحرا میں اب بھی لہروں کی صورت میں گونجتی رہتی ہے

وہ کیا گیا، جینے زندگی کے گہرے اور سرار و سوز

اس کی پیچیدگیاں اس کے اتار چڑھاؤ

سمجھنے والا سمجھانے والا چلا گیا

اب مجھے وہ راستے وہ پگڈنڈیاں، وہ مقامات یاد آتے ہیں

کہ جہاں مجھے اس کا روحانی قرب میسر ہوتا

بس ایک وہ تھا

اور دوسرا میں

باتیں ہی باتیں

نہ ختم ہونے والی باتیں
اپنوں کی، غیروں کی
اب اس گلی کی طرف جانے کو جی نہیں چاہتا
جہاں اس کا گھر تھا

وہ میرے میر صاحب

عبدالوحید کلاچی

اس کا وجود

سراپا محبت تھا

وہ محبت اور خلوص اور پاکیزگی کا مجسمہ تھا

ریاکاری، غیبت، جھوٹ، فریب، چوروں کی مانند

ہمیشہ اس کے وجود سے دور کھڑے رہتے تھے

وہ فرشتہ نما انسان

جس کی آنکھیں ہمیشہ اشکبار رہتی تھی

انسانیت کے دکھوں پر وہ پہروں روتا رہتا تھا

ابا عبداللہ کا نام سنتے ہی اسکی سسکیاں بندھ جاتی تھیں

اسے اس لافانی ہستی سے بے لوث محبت تھی

بلکہ وہ اس سے عشق کرتے تھے۔ ٹوٹ کر

ابا عبداللہ کی خاطر

وہ پورے معاشرے سے ٹکرا گئے

ہزاروں دشمنیاں مول لیں

وہ بہت بلند حوصلہ تھے وہ ہمالیہ سے بھی مجھے اونچے محسوس ہوتے تھے

تمام دوستوں کے دکھوں پر وہ تڑپ جاتے تھے

اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینے والے

اپنی اولاد پر اولادِ رسول کو فوقیت دینے والے

اولادِ پیغمبر کی خاطر اپنے خاندان اور ارد گرد کے اپنے بدترین قبائلی نظام کے طعنے اور تہمتوں کے تیر سہنے والے

وہ میرے میر صاحب ہم سب کے میر صاحب

اب ہم میں نہیں رہے۔ وہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔

حافظ عبدالواحد شاہوانی مستونگ

میر نادر عزیز کرد سے میری ملاقات رائے ونڈ کے اجتماع میں ہوئی ۔ یہ غالباً ستر کی دھائی کے آخری سال تھے ۔ میرے مستونگ کے دوست محمد حسن آب زئی نے میرا ان سے تعارف کرایا ۔ میر صاحب مجھے دیکھ کر مسکرائے اور مجھ سے بلوچی حال احوال کیا ۔ مجھے یک گونہ خوشی بھی تھی کہ بی ایس او اور نیپ کی نامی گرامی شخصیت مذہب کی طرف متوجہ ہوئی ہے اس سے پہلے میری میر صاحب سے بالمشافہ ملاقات تو نہیں ہوئی تھی ۔ البتہ میں نے انکا نام بہت سنا تھا اور ایک ہی شہر سے تعلق کی وجہ سے میں انہیں اور انکے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا ۔ مستونگ میں شاید ملاقات کا امکان اس لئے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم دونوں نظریاتی طور پر بالکل مخالف کیمپ سے تعلق رکھتے تھے ۔ میں جمعیت طلبائے اسلام J.T.I مستونگ کا امیر تھا ۔ جبکہ میر صاحب بی ایس او کے مرکزی شخصیات میں سے تھے ۔ اس زمانے میں دائیں اور بائیں بازو کی چپقلش اپنے عروج پر تھی ۔ ہم اسلامی نظام کی جب کہ یہ لوگ سوشلسٹ نظام کی بالادستی کی مہم چلا رہے تھے ۔

میر صاحب نے رائے ونڈ میں دوستوں سے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے ۔ میں یہ سن کر اٹھا اور چپ چاپ نزدیکی ہوٹل سے کھانا لے آیا میر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ سے ہماری دوستی خوب رہے گی ۔

رائے ونڈ میں مجھے میر صاحب کی شخصیت کا اجمالی اندازہ ہو چکا تھا کہ میر صاحب معمولی بصیرت کے حامل نہیں ۔ بلکہ گہرے آدمی ہیں ۔ وہ دین کو گہرائی سے سمجھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں وہ صرف شخصی جنت کے حصول کیلئے کوشاں نہیں بلکہ دین کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں اور اسے معاشرے کے ہر شعبہ میں بالادست دیکھنا چاہتے ہیں یہی وجہ تھی کہ میر صاحب ہر عمل انجائی

اخلاص سے انجام دیتے اور ہر چھوٹے بڑے عمل کے متعلق سوال ضرور کرتے ابتداء میں میں یہ سمجھا کہ شاید اسکول اور کالجوں سے پڑھے لکھے، افراد کی یہ عادت ہوتی ہے۔ کہ ہر بات پر سوال وجرح کرتے رہیں۔ لیکن مجھے جلد اسکا اندازہ ہو گیا کہ میری رائے غلط تھی میر صاحب چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی غور وفکر اور اصل روح سمجھے بغیر انجام نہیں دیتے تھے۔ ویسے بھی میر صاحب کی بڑی سیاسی حیثیت کے پیش نظر رائے ونڈ میں بزرگ ان پر خصوصی توجہ دیتے۔ اور ان سے ملاقاتیں کرتے۔

میر صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کی جاذبیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انکی ذات میں اتنی مقناطیسی کشش رکھی تھی جو بھی سلیم الفطرت شخص ایک دفعہ ان کی نشست میں بیٹھ گیا۔ وہ پھر ان ہی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ اسے دوسری محافل میں مزہ نہیں آتا تھا۔ میر صاحب کے وجود سے اپنائیت اور وجاہت کی بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی تھی۔

تبلیغی جماعت کے بہت سے واقعات ہیں لیکن ایک واقعہ بڑا دلچسپ اور انکی متوکل شخصیت کو سامنے لاتا ہے۔

تبلیغی جماعت میں یہ معمول ہے کہ کھانے پینے کے حوالے سے ہر روز کی باری بندھی ہوتی ہے جب میر صاحب کا شام کی چائے کا نمبر آتا۔ میر صاحب پتی اور چینی جو فی فرد کے حساب سے کوٹہ کے تحت دی جاتی تھی سے کیتلی بھر کر چائے تیار کرتے ہر شخص حیران ہوتا کہ اتنی کم مقدار میں کیسے ٹھیک چائے بن سکے گی لیکن جتنی مزیدار اور سیر ہو کر وہ چائے پی جاتی۔ اسکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ اور لوگوں نے اس کی کوشش کی تو کامیابی نہ ہو سکی۔ میر صاحب نے بعد میں اسکی بنیادی وجہ اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر دینا۔ اور توکل قرار دیا۔

رائے ونڈ سے واپسی پر میری میر صاحب سے دوستی ارادت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور یہ دوستی انکی وفات تک قائم رہی۔ میر صاحب سے اکثر وبیشتر ملنے جاتے۔ اور انکے پاس ہمارا قیام مہینوں رہتا۔ لیکن انکی محفل سے ہمارا دل نہیں بھرتا تھا۔ بعد میں میر صاحب نے تبلیغی جماعت کو چھوڑ دیا۔ اور انکی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ میں جس چیز کی تلاش میں وہاں گیا تھا وہ وہاں نہیں ملی

تبلیغی جماعت چھوڑنے کے بارے میں جہاں تک میں میر صاحب کو سمجھ سکا کہ تبلیغی جماعت کے حوالے سے میر صاحب شروع سے فٹ نہیں تھے۔ کیونکہ انکا شروع سے سوالات، غور وفکر پر عمل انجام دینے سے پہلے پوشیدہ حکمت عملی کو سمجھنے کا جذبہ تبلیغی جماعت کے بزرگوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ میں یہی دیکھتا تھا کہ تبلیغی جماعت کے بزرگوں کو انکا زیادہ سوال کرنا شاق گزرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میر صاحب ایک انقلابی ذہن کے مالک متحرک اور فعال شخصیت تھے کہ جنہوں نے زندگی کا ایک فعال عرصہ بی ایس او جیسی نیشنلسٹ تنظیم میں گزارا تھا۔ اور وہ اسلام کو انقلابی دین سمجھ کر تبلیغی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ اور انکا کہنا تھا کہ انقلابی نظریہ کے تحت انقلابی پارٹی کو بھی متحرک اور انقلابی ہونا چاہئے جبکہ تبلیغی جماعت میں سوائے عبادات ذکر واذکار کے کچھ نہیں تھا اور نہ ہی یہ عملی لحاظ سے مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کرتے تھے دوسری چیز جو میں نے نوٹ کی کہ میر صاحب خالی الذہن ہو کر تبلیغی جماعت میں نہیں گئے تھے کہ جو چاہے ڈال دیا جائے۔ میر صاحب کامل مطالعہ کے نتیجے میں اسلام کو سمجھ کر اور وہ علماء کو رسول اکرم کی آئیڈیل شخصیت کے تناظر میں دیکھتے تھے۔ اور اگر انہیں علماء میں سیرت وکردار کے حوالے سے وہ چیزیں نظر نہیں آتیں تو آپ رد کر دیتے۔ میں نے میر صاحب سے دوستی کے باوجود ایک فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں بلوچستان میں دیوبندی مکتب کے ایک نامور گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور خود بھی مدرسہ کا فارغ التحصیل حافظ قرآن ہوں۔

مجھے میر صاحب کا مذہبی معاملات میں اس طرح کا طرز فکر پسند نہ تھا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ اس سے میر صاحب کہیں خدانخواستہ دوبارہ لادینیت کی طرف نہ لوٹ جائیں۔ ہمارے مدارس کا نظام بھی کچھ اس طرح ہے کہ جس میں اعتراض واختلاف بحث وتمحیص کو پسند نہیں کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں عقل کی بجائے نقل کو بنیادی مصدر قرار دیا جاتا ہے۔ کہ جو کچھ بھی شریعت نے کہہ دیا بس اسے بلا چوں وچرا قبول کرلو، اس میں عقلی غور وفکر کی گنجائش نہیں میں نے میر صاحب پر بہت زور دیا کہ وہ اپنی اس روش کو تبدیل کرلیں لیکن جب میں میر صاحب کا دین کے بارے میں

اخلاص، تڑپ اور بے چینی کو دیکھتا اور انکے عقلی و منطقی دلائل سنتا تو خاموش ہو جاتا۔

تبلیغی جماعت سے علیحدگی کے بعد جب میر صاحب مرشد کامل کی تلاش میں تھے تو مولانا عبداللہ درخواستی اور مولانا اللہ یار چکڑالوی کے پاس میر صاحب کو میں ہی لے گیا تھا۔ کیونکہ ہمارے مستونگ کے بیشتر علمائے دیوبند انہیں بزرگان کے دست بیعت تھے ان ہستیوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کچھ وقت لگانے کے بعد میر صاحب ان سے بھی جلد مایوس ہو گئے۔ میر صاحب نے تھوڑے عرصہ کیلئے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی البتہ جب بھی کسی بزرگ کے متعلق خبر ملتی تو میر صاحب ضرور جاتے کئی جگہوں پر مجھے بھی ساتھ لے کر گئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے کراچی اور پنڈی کے سفر بھی کئے میں دل ہی دل میں دعائیں مانگا کرتا کہ اللہ پاک میر صاحب کو جس منزل کی تلاش ہے وہ مل جائے۔ میر صاحب کہیں کسی بدعتی فرقہ کے ہاتھ نہ لگ جائیں لیکن میر صاحب اپنی ذات میں مطمئن تھے وہ ہمیں بھی اللہ پاک سے اخلاص کے ساتھ ہدایت کی دعا طلب کرنے کو کہتے ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ حافظ صاحب اللہ پاک نے لاکھوں مسلمانوں کی قربانی کے بعد ہمیں کتنا حسین پر از نعمت خطہ پاکستان کی صورت میں دیا۔ لیکن ہم نے اللہ پاک سے اپنے کئے گئے عہد کی پاسداری نہیں کی کہ اسے ہم ساری دنیا کے انسانوں کیلئے ایک ماڈل اسلامی ریاست بنائیں گے وہاں تیرے نظام کی حکمرانی ہوگی۔ طبقاتی امتیاز اور غریب و امیر میں فرق نہیں ہوگا۔ لیکن ہم نے اس عہد کو پورا نہیں کیا۔ اور اس ملک میں نفسانیت حرص، لوٹ کھسوٹ کرپشن، بے حیائی، منافقت قوم پرستی مسلمانوں کو اپنے سیاسی مقاصد کیلئے لڑانا شروع کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم سے روٹھ گئی ہے آدھا ملک سزا کے طور پر ہم سے چھینا جا چکا ہے ظالم و جابر منافقین کا راج ہے وہ کہتے تھے کہ دعا کرو اللہ پاک اس ملک میں ہمارے لئے کوئی نجات دہندہ (دیدہ ور) بھیج دے اکثر اقبال کا یہ شعر گنگناتے تھے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایران کے انقلاب کے دوران میر صاحب بے چین رہتے۔ وہ خبریں غور سے سنتے اور پیش آمدہ صورتحال کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ ضرور کرتے ان ہی کی وجہ سے ہمارے دوستوں میں انقلابی تبدیلی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

میر صاحب کی شخصیت تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ تعصب انسان کی انسانیت کو زنگ آلود کر دیتا ہے۔ متعصب انسان کبھی حقائق تک پہنچ نہیں سکتا۔ وہ ایمان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ ایمان کا مطلب حقائق کو تسلیم کرنا ہے جتنا زیادہ کوئی شخص حقائق کو قبول کرنے کا عادی ہوگا اس حساب سے ایمان میں اضافہ ہوگا اور اس میں ایمان اور حقیقت پسندی کی روشنی بڑھتی چلی جائے گی کافر وہ ہے جو باوجود عقل رکھنے کے کائنات کی سب سے بڑی صداقت کائنات کے مالک کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے وہ حقائق قبول نہ کرنے کی وجہ سے قابل مذمت اور نجس ہے اور اسے کافر کہا جاتا ہے۔ وہ پیغمبر کی ایک حدیث سناتے تھے۔

عصبیت زدہ انسان کی مثال پاخانہ میں پیدا ہونے والے کیڑے کی طرح ہے جو پاخانے سے پیدا ہوتا ہے اسی کو کھاتا ہے۔ اور وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالٰی سے تنگ نظری سے بچنے کی دعا مانگتے تھے۔

میر صاحب حد درجہ سخی تھے ان کی مچھ میں کول مائنز تھیں۔ جن سے معقول آمدنی ہوتی تھی۔ انہیں ہر جمعرات کو پیسے وصول کرنے کیلئے کوئٹہ آنا ہوتا تھا۔ جمعرات کو وہ ضرورت مند دوستوں کی جیبوں ایک معقول رقم ڈال دیتے تھے۔ اسکے علاوہ بہت سے یتیم بیوہ گھرانوں کی بھی ماہانہ سرپرستی کرتے۔ جب کبھی کوئی ضرورت کی چیز خریدنے بازار جاتے تو دوستوں کیلئے بھی وہی چیز خریدتے جو خود پسند کرتے۔ سردیوں میں ٹرک بھر کر کوئلہ مستونگ میں دوست احباب، علماء و فقراء کیلئے بھیجتے۔ میر صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم فیصلہ ان کا مکتب اہلبیت کو قبول کرنا تھا اور وہ اسی عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے کہ محبت اہل بیت ان کے دل میں جاگزیں ہو چکی تھی

سید علی اوسط

یہ غالباً 1986ء کا واقعہ ہے میر صاحب اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کیلئے کراچی آئے ہوئے تھے۔ میر صاحب کی پرسنیلیٹی خاصی جاذب نظر تھی۔ وہ کانفرنس ہال میں انگوٹھی میں نگینہ کی طرح نمایاں نظر آ رہے تھے۔ وقفے کے دوران تعارف ہوا۔ پتہ چلا کہ بلوچستان کی سابقہ قوم پرست شخصیت ہیں اور اب اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں بڑے فعال ہیں میر صاحب دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔ اور ایک پرخلوص شخصیت کے مالک تھے۔

ان سے گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ موجودہ سیاسی کلچر سے مایوس ہیں اور یہاں بھی اسلامی انقلاب کیلئے کوشاں ہیں وہ امام خمینی کے عاشقوں میں سے تھے۔ اور انہیں کی وجہ سے وہ پاکستان میں تبدیلی کیلئے پرامید تھے۔ میں اس زمانے میں تحریک جعفریہ شہید حسینی کے ساتھ مربوط تھا۔ اور ہمارا دفتر رضویہ سوسائٹی میں تھا۔ میر صاحب متعدد بار ہمارے دفتر تشریف لائے۔ اور ان سے مختلف موضوعات پر طویل نشستیں ہوتی رہیں۔

مجھے یاد ہے۔ شہید عارف حسین الحسینی سے بھی آپ سے یہاں کئی نشستیں ہوئیں آپ شہید حسینی کی انقلابی فکر استعمار دشمن رویہ اور اتحاد بین المسلمین کے حوالے سے واضح نظریات سے بہت متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے جدوجہد کیلئے کئی مشترکہ نکات پر اتفاق کیا تھا۔ جن میں سے چند مجھے یاد ہیں۔

1۔ مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنا

2۔ استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مل کر مقابلہ کرنا

3۔ مسلم نوجوانوں میں انقلابی شعور، سیاسی بیداری پیدا کرنا۔

آپ جب بھی کراچی آتے، قصر ناز میں ٹھہرتے وہاں سے ہمیں فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دیتے میر صاحب کے بہنوئی میر خلیل احمد مینگل جو کہ سپر نٹنڈنگ انجینئر C&W تھے۔ ان سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ میر صاحب کے توسط سے ہمارا کاروباری رابطہ میر نصیر مینگل سابقہ وزیر اعلیٰ اور صالح محمد بھوتانی سے بھی رہا۔ میں بعد میں انکے مستونگ اور وڈھ کے گھر میں بھی ان سے ملنے گیا۔

شہید حسینی کی شہادت پر میر صاحب کو بہت زیادہ صدمہ تھا۔ شہادت کے بعد جب میں پہلی بار ان سے ملا تو کافی دیر شہید کی سیرت، تقویٰ انکی اخلاقی خوبیوں اور انقلابی جدوجہد پر بات کرتے رہے۔ اور آنسو بھی بہتے جاتے تھے۔ میر صاحب کا کہنا تھا کہ ان کی شہادت کے پیچھے امریکی CIA کا ہاتھ ہے۔

اگست 1996 میں میر صاحب نے دوستوں کے اعزاز میں ہزار گنجی کوئٹہ میں پکنک کا انتظام کیا تھا میں اتفاق سے کراچی سے آیا ہوا تھا۔ جس میں کئی سو مہمان شریک ہوئے تھے۔۔ میر صاحب کم گو تھے۔ مختصر اور جامع گفتگو کرتے تھے۔ اور تمام محفل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ کیا کمال کی شخصیت تھی۔

1997ء میں انکا بیماری کے سلسلے میں کراچی آنا جانا لگا رہا۔ میں جمال اصغر صاحب سے انکی طبیعت کے سلسلے میں مسلسل رابطے میں رہتا تھا۔ انکا سرجن رضوی نے گردوں کا آپریشن بھی کیا تھا۔ لیکن افاقہ نہیں ہوسکا بعد میں انہیں آغا خان ہسپتال میں شفٹ کر دیا گیا۔ میں اکثر وہاں ان کی عیادت کو جاتا رہا۔ جمال اصغر صاحب نے ٹیلی فون پر میر صاحب کی ناگہانی رحلت کی اطلاع دی اور کہا کہ جنازہ مسجد باب العلم شمالی ناظم آباد لایا جارہا ہے۔ میں چند دوستوں کے ساتھ

۱۔ صحیح بخاری 2/264 باب تفسیر انبیاء ۲۔ صحیح مسلم 3/433 باب فضائل اثبات ۳۔ مسند احمد بن حنبل 6/ 312,307,299 جامع کنز العمال 11/252 کتاب الفتن استیعاب 2/397

وہاں پہنچا۔ وہاں اسکے بڑے بیٹے طاہر عزیز اور بھتیجے ہمایوں عزیز بھی موجود تھے۔ غسل کے بعد مولانا حامد موسوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور دوسرے دن انکی میت بذریعہ طیارہ کوئٹہ روانہ کردی گئی اللہ تعالیٰ میر صاحب کے درجات بلند فرمائے۔

میر حامد عزیز کرد

نادر جان مرحوم میرے بڑے بھائی تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ میرے بہت شفیق بھائی اور مہربان دوست تھے۔ ہمارے خاندان کا پس منظر سیاسی تھا۔ اور والد صاحب قلات ریاست میں انتخابی سیاست کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی سیاسی ماحول کے زیر اثر ہم تین بھائیوں نے بھی سیاست کو خصوصاً قوم پرست سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ بڑے بھائی محمود عزیز کرد تو سینٹ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ نادر عزیز اور میں عملی اور عوامی سیاست میں زیادہ سرگرم رہے۔

نادر جان اگرچہ مجھ سے زیادہ بڑے نہ تھے لیکن ان کا میرے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ سلوک اور رویہ رہا۔ اور انہوں نے ہمیشہ میری بہتری اور رہنمائی کی کوشش کی۔

نادر جان سے ملنے والے احباب جانتے ہیں کہ ان کے نحیف و نزار جسم میں ایک عجیب طاقتور اور بے چین روح تھی۔ جو انہیں کسی لمحے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ نادر جان ہمیشہ سے ایسے نظام کی تلاش میں تھے جو عوام کو محرومی وڈیرہ شاہی سرداروں کے مظالم سے نجات دے سکے۔

نیپ کی سیاست کے زمانے میں بھائی صاحب نے مارکسزم اور سوشلزم وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ لیکن ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ نظام ہمارے قبائلی معاشرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے اور وہ یہ بات اپنے قریبی دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ ایسے متعدد احباب موجود ہیں جو ان باتوں سے آگاہ ہیں۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ نادر جان نیپ کی قوم پرستانہ سیاست سے اکتا گئے اور انہوں نے مذہب کی طرف اور مذہبی جماعتوں کی طرف رخ کر لیا۔ سب سے پہلے تبلیغی جماعت میں گئے وہاں لگ بھگ تین سال گزارے لیکن پھر تبلیغی جماعت کو چھوڑ کر جماعت اسلامی میں شامل

ہو گئے۔لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جماعت اسلامی کو بھی چھوڑ دیا۔وہ کسی مرد کامل کی تلاش میں تھے جوان کی بے چین روح کو قرار بخش سکے۔اس سلسلے میں مختلف علماء اور پیر صاحبان کے پاس بھی جاتے رہے لیکن کہیں بھی سکون قلب میسر نہیں آسکا۔ایک بات جو ذکر کرنا شاید ضروری ہے کہ نادر جان مرحوم مطالعے کے بہت شوقین تھے۔اور اس مطالعہ میں وہ اپنے احباب کو بھی شریک کرتے تھے۔انہی دنوں ایران میں انقلاب برپا ہو چکا تھا اور خطے کے سب سے طاقتور ملک کے مطلق العنان بادشاہ کو وہاں کے علماء نے عوام کی مدد سے اقتدار سے محروم کر دیا تھا۔نادر جان مختلف نشریاتی اداروں سے ایران کے انقلاب سے متعلق تازہ ترین خبریں سنتے اور اپنے دوستوں کو بھی تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرتے ۔نادر جان کو سب سے بڑی خوشی اسی بات کی تھی کہ ایران کے مظلوم عوام نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔

ایرانی انقلاب کے مطالعہ اور اس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی کیلئے نادر جان نے ایران کا سفر بھی کیا۔وہاں حکومتی عہدیداروں،عام لوگوں،طلبا اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔اور انقلاب سے متعلق ایک گہرا تاثر لے کر وطن واپس آئے۔یہاں آکر انہوں نے اس بات پر غور شروع کیا کہ آخر وہ کونسی قوت تھی جس کے بل بوتے پر ایران کے نہتے عوام نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشائیت کا خاتمہ کر کے وہاں عوام کی حکومت کی بنیاد رکھی۔کثیر مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ حسینیت کا اعجاز اور کمال ہے کہ جس نے جابر وظالم بادشاہ کے سامنے عوام کو سرخرو کیا۔پس انہوں نے حسینیت کا مطالعہ شروع کیا۔اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عوام کے دکھ،درد مصائب کا حل اسی میں ہے کہ ہم حسینی بن جائیں۔اور ہر ظالم وجابر کے سامنے ڈٹ جائیں۔اور انہوں نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ وہ امام حسین کے سرخ راستے کے مسافر ہو گئے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے کبھی کسی قسم کے مفاہمت نہیں کی۔حتیٰ کہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ان کے انتقال سے ہم ایک ہمدرد شفیق اور مخلص بھائی سے محروم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

ماسٹر عبدالقادر محمد شہی

میر نادر عزیز کا تعلق ایک اہم سیاسی اور قبائلی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد محترم میر عبدالعزیز کرد تھے جنکا طائفہ "مدے زئی" سے تعلق تھا۔ کردوں کا شمار دنیا کی قدیم ترین اقوام میں ہوتا ہے۔ انکی اپنی زبان تمدن ادب، تاریخ اور عوامی روایات ہیں اور دوسری قوموں سے انکا الگ لباس طرز معاشرت اور قومی کردار ہے۔ سلطنت عثمانیہ میں کردستان کے نام سے انکا ایک الگ صوبہ تھا۔ مگر پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر کردستان کا شمالی حصہ روس کے پاس چلا گیا جبکہ جنوبی علاقہ شام اور عراق میں تقسیم ہو گیا اور مشرقی علاقہ ایران کا حصہ بنا۔ کرد اس وقت دنیا کے مختلف ممالک مثلاً پاکستان کا صوبہ بلوچستان، ایران، ترکی شام، روس آرمینیا اور عراق کے علاوہ وسط ایشیاق، کے ممالک میں بکھرے ہوئے ہیں مگر بلوچستان کے کرد سیاسی کردار کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور بلوچستان میں سیاست کا سہرا میر عبدالعزیز کرد کے سر ہے کیونکہ پورے بلوچستان میں 1935ء سے پہلے کوئی سیاسی پارٹی وجود نہیں رکھتی تھی۔ میر عبدالعزیز کرد نے قلات نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی صحبت سرائے بی میں منعقدہ پہلے اجلاس میں آپ کو متفقہ طور پر پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس پارٹی کے اغراض و مقاصد میں ریاستی ملازمتوں پر بیرونی افراد کے غلبہ کو ختم کرنا ترجیحی بنیادوں پر تھا۔ آپکے سیاسی رفقاء میں میر یوسف عزیز مگسی آغا عبدالکریم خان احمد زئی خان عبدالصمد خان اچکزئی، میر غوث بخش بزنجو، میر عبدالواحد کرد، میر فاضل محمد خان محمد شہی، ملک سعید دہوار، ملک فیض محمد یوسفزئی، ولجہ محمد حسین عنقا اور میر گل خان نصیر جیسے سیاسی بصیرت رکھنے والے مدبر شامل تھے۔ جنکی شبانہ روز محنت سے بلوچستان کی سیاسی تحریک کو بڑی تقویت ملی۔

میر نادر عزیز میر عبدالعزیز کرد کے منجھلے بیٹے تھے۔ انکی شخصیت اپنے خاندان میں سب سے الگ اور نمایاں ہے اور انتہائی شریف النفس اور کم گو انسان تھے۔ تنگ نظری سے آپ کا دامن پاک تھا۔ نوجوانوں کی عزت افزائی ہمیشہ آپکے پیش نظر رہتی۔ بلا کسی تفریق کے آپ غریبوں کی داورسی کرتے کوئی سائل آپکے در سے خالی نہ جاتا۔ اجنبی پر بھی اعتبار کرتے تھے۔ آپ کا سن پیدائش 1945ء ہے آپ نے ابتدائی تعلیم مستونگ میں حاصل کی اور کوئٹہ سے گریجویشن کی کالج کے زمانہ میں آپ نے بی ایس او کے پلیٹ فارم سے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا نیپ کی جدوجہد کے دوران میر صاحب کے ساتھ قربت آپکے سیاسی احباب میں میر بزن بزنجو، آغا غلام سرور صاحب احمدزئی، میر غلام رسول صاحب رئیسانی اور ملک عبدالمجید صاحب جیسے طفسار شامل تھے۔ 1973ء میں بلوچستان پر فوج کشی کے دوران آپکا خاندان بھی متاثر ہوا۔ آپکے بڑے بھائی سابق سینیٹر میر محمود عزیز کو سنٹرل جیل مچھ میں اور چھوٹے بھائی میر حامد عزیز سینٹرل جیل حیدر آباد میں مقید ہوئے اور آپ خود بھی زیر عتاب رہے جب نیشنل عوامی پارٹی گروہ بندی اور اقرباء پروری کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تو آپ سیاست کو خیر باد کہہ کر مذہب کی طرف راغب ہوئے اور اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مختلف مذہبی جماعتوں کے منشور کا بغور مطالعہ کیا۔ جن میں تبلیغی جماعت جماعت اسلامی جمعیت العلماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان وغیرہ شامل تھیں تبلیغی جماعت سے کچھ عرصہ منسلک رہے وہاں دلوں کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی تو طے پایا کہ جماعت اسلامی سے رجوع کیا جائے۔ استاد غلام علی کے مشورہ پر سترہ (17) افراد پر مشتمل ایک وفد میر نادر عزیز کی سربراہی میں جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹر لاہور (منصورہ) کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً دو ہفتہ منصورہ میں قیام کے دوران جماعت کے اکابرین سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ جب واپس کوئٹہ پہنچے تو چند روز بعد معلوم ہوا کہ کوئٹہ کی مسجد طوبیٰ میں اتحاد بین المسلمین کے زیر اہتمام ایک جلسے کا پروگرام ہے۔ جس میں تمام مذہبی جماعتوں کے نمائندے مدعو تھے۔ اس جلسہ کے مہمان خصوصی تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے سربراہ جناب سید شہید عارف

حسین الحسینی صاحب تھے۔ اس جلسہ میں مختلف اکابرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا جلسہ کے بعد میر صاحب کی سرکردگی میں جناب عارف الحسینی صاحب سے تفصیلاً ملاقات ہوئی اور مختلف امور پر سوالات کئے اور تمام ساتھی شہید کی شخصیت اخلاق اور علم فہمی سے انتہائی متاثر ہوئے ان دنوں ایران میں اسلامی انقلاب آچکا تھا اور ریڈیو زاہدان کا اردو پروگرام پابندی سے سنتے تھے۔ جو عالم اسلام کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں اتفاق کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اب رجحان ایران کے اسلامی انقلاب کے طرف ہوا۔ رات کو پروگرام سن کر آپس میں تبصرہ کرتے تھے آخر میر صاحب نے ایک پروگرام ترتیب دیا کہ روزانہ دس گھنٹے مختلف مذہبی کتب مثلاً صحیح بخاری صحیح مسلم سنن ابوداؤد، موطا، تحفہ اثناء عشریہ اور تاریخ وغیرہ کے مطالعہ کے لئے وقف ہیں۔ دوران مطالعہ و تحقیق ایک دوست میجر عبدالقادر شاہوانی مرحوم نے حضرت علی علیہ السلام کے خطبات پر مشتمل کتاب (نہج البلاغہ) کا تذکرہ کیا تو میر صاحب نے یہ اہم نسخہ بھی منگوالیا۔ اس کے مطالعہ سے حق کی راہیں کھل گئیں اور ایران کے انقلاب کے اثرات کو قریب سے دیکھنے کیلئے میر صاحب نے ایران کے مقدس مقامات کی زیارات پر گئے۔ علماء سے ملاقاتیں کیں اور وہاں کے عوام کے تاثرات معلوم کئے جو انتہائی خوش اور با اعتماد لگتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں بداعتمادی اور تفرقہ بازی ہر جگہ موجود ہونے سے نہ ہم ایک قوم ہیں اور نہ ہمارے ہاں مذہبی رواداری ہے یقیناً مذہب سے بے گانگی تفرقہ بازی اور گمراہی کا نتیجہ ہے۔ اگر امت تفرقہ بازی سے دور رہتی تو آج مسلمانوں پر زوال نہ آتا اور امریکہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو ہماری سرزمین سے گرفتار کر کے اپنے ملک لے جا کر زہر کا انجکشن نہ دیتے۔ لہذا تحقیق کرنا چاہئے کہ امت میں گمراہی کیوں آئی۔

آپ نے ہمارے لئے یہ پیغام چھوڑا کہ دنیا و آخرت کی تمام مشکلات کا حل اور امت کی خوشحالی کا راستہ صرف اور صرف قرآن مجید اور عترت رسول مقبولؐ کی پیروی ہے۔ کیونکہ آپؐ سے بہتر پیشوا کوئی نہیں اور نہ کوئی آپکا ہمسر ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے محمدؐ اور اولاد علیؑ سے بغض رکھنے والوں کو ہدایت فرمائے۔

مردہ باد امریکہ

محافظِ اقدار۔۔۔۔۔۔میر نادر عزیز کُرد

مرتضیٰ علی۔ کراچی

تمام حمد وستائش پروردگارِ عالم کے لئے مخصوص ہے اور بے پایاں درود وسلام ہو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آلِ محمدؐ پر۔

آج ناچیز ایک ایسی شخصیت پر خامہ روائی کی جرات کر رہا ہے کہ جسے گوہر یگانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس حقیر کا میر صاحب کے ساتھ تعارف کوئی بہت پرانا نہ تھا۔ شاید ۱۹۹۲ء میں پہلی ملاقات ہوئی تھی، مگر اس پہلی ہی ملاقات کے تاثر اور تازگی کو اب تک میں فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام کراچی میں گزارے تھے۔ پہلی اور آخری ملاقات کے درمیان ان سے کراچی اور بلوچستان میں کئی بار فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ جس کے دوران ان کی شخصیت کے کئی خوبصورت پہلو میرے سامنے آئے۔ جسے کماحقہ رقم کرنے کی طاقت میرے کمزور قلم کے بس کی بات نہیں ہے لیکن ان کی شخصیت کے ایک پہلو کو بیان کروں گا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔

قارئین محترم یقیناً اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا کے تمام انسان بعض اقدار کے ضرور قائل ہوتے ہیں تاہم نشیب وفراز زندگی میں کچھ ہی لوگ ان اقدار کی حفاظت کر پاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے زندگی کے سخت ترین مراحل میں بھی اپنی معنوی اقدار کی حفاظت کی آج وہ لوگ تاریخ کے صفحات میں امر ہو گئے ہیں۔

میر نادر عزیز گرد۔ اپنی تمام تر روشن خیالی اور دین اسلام اور اسلامی اقدار سے عشق کے باوجود بلوچوں کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے بھی پاسدار تھے۔

وہ ایک بہت سرد رات تھی۔ آگ روشن تھی اور سب لوگ آگ تاپ رہے تھے، واقعتاً چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میر صاحب تشریف لائے ان کے ہمراہ سبز چائے بھی تھی آپ نے کمال شفقت و مہربانی سے شیشہ کے چھوٹے سے گلاس میں گرم گرم چائے انڈیل کر سب کو دی۔ مجھے بھی انہوں نے اپنے ہاتھوں سے چائے پیش کی۔ چونکہ کوئٹہ کا موسم ہمارے لئے بہت سخت ہوتا ہے اس لئے میں نے تو فوراً گرم گرم چائے ختم کر ڈالی اور اپنا گلاس وہیں سامنے رکھ لیا۔ میر صاحب کے مہربان ہاتھوں نے آگ پر رکھی چائے کی کیتلی اٹھائی اور میرا گلاس دوبارہ بھر دیا۔

''میر صاحب! معذرت چاہتا ہوں، کم از کم آپ پوچھ تو لیتے کہ مجھے مزید چائے درکار ہے؟'' میں نے برسبیل تذکرہ کہا تھا۔

''ہماری بلوچ روایات کے مطابق چائے مزید طلب کرنی ہو تو خالی کپ سیدھا رکھ دیا جاتا ہے۔'' بڑے پیار سے جواب دیا گیا۔

''مگر میر صاحب کیا اسلامی روایات میں بھی ایسا ہی ہے۔'' (مزاحاً)

''بھئی جہاں تک ہماری بلوچ روایات اسلامی روایات سے متصادم نہیں ہیں تو کیا حرج ہے کہ ان کی بھی پاسداری کی جائے۔'' میر صاحب نے بھی ہلکے پھلکے لہجے میں مزاحاً جواب دیا۔

میر صاحب کے اس برتاؤ نے مجھے مبہوت کر دیا۔ اک خوشگوار سا اثر رہ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ''بوڑھے بلوچ کی جوان کو نصیحت'' میں جو مقامی اقدار کی عکاسی کی ہے وہ کتنی حق بجانب ہے۔

میر صاحب کے ایک سادہ سے برتاؤ نے کتنی پیچیدہ گرہ کو کھول دیا۔ اسلامی ثقافت کا ایک درخشاں پہلو سامنے آگیا کہ یہ کبھی بھی مقامی ثقافت سے نہیں ٹکراتی مگر بقول میر صاحب مرحوم کے کہ ''اسلامی اقدار چند اصولوں پر مبنی ہیں جیسے خلوص، سادگی، سچائی، ہر حال میں خدا کو

حاضر و ناظر جاننا، میل جول اور روابط میں پیچیدگیوں کے بجائے سادگی اختیار کرنا............ میں اب بھی سوچتا ہوں کہ کاش میں نے یہ سب باتیں ریکارڈ کرلی ہوتیں یا کم از کم لکھ ہی لی ہوتیں۔

میر صاحب آگے چل کر فرمانے لگے۔ اگر مقامی روایات اسلامی روایات کے Parallel چل سکیں تو بہت اچھا ہے، انھیں چلانا چاہئے کہ لوگوں کو ان کی عادت ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ نے بھی انھی اقدار کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ مگر جب مقامی اقدار اسلامی اقدار و اصول سے متصادم ہوں تو پھر اسلامی اقدار کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ یہ تو اسلامی ثقافت کی جامعیت ہے کہ جس علاقے میں اسلام پہنچا وہاں کی اچھی اقدار کو جذب کرلیا اور بری اقدار پر خود حاوی آ گیا۔

یہ اسلامی اقدار کی قوت تھی کہ ہندی معاشرہ جو کہ بڑی بڑی تہذیبوں کو ہڑپ کر گیا، وہاں کے مسلمان اپنے جداگانہ تشخص پر برقرار رہے یہاں تک کہ وطنِ عزیز پاکستان کی صورت میں ایک الگ ملک ظہور پذیر ہوا۔ آج بھی مسلم روایات کی طاقت دیکھیں کہ ہندی معاشرے میں مسلمان اور ہندو سلام دعا سے لے کر ہر ہر مرحلے پر ممتاز ہیں۔

چنانچہ میر صاحب مرحوم سے کئی ملاقاتوں میں میں نے محسوس کیا کہ آپ کی زندگی پر اسلامی اور بلوچ قبائلی روایات و اقدار کا غلبہ تھا۔

مذہب حقہ اہل بیتؑ کی جانب رجحان کے باعث، متعصب ذہنیت کے لوگوں نے آپ کو شدید دباؤ کے زیرِ اثر قرار دے دیا تھا گو کہ آپ جس شاندار، متحرک، مزاحمتی ماضی کے حامل تھے اور جو قربانیاں آپ نے ماضی میں اپنے لوگوں کے لئے پیش کی تھیں اور جو احسانات آپ کے اپنے قبیلے اور اپنے علاقے کے لوگوں پر تھے اس کی وجہ سے کھلم کھلا کوئی جرات نہ کر سکا کہ آپ کی حیات میں کوئی خلافِ مصلحت قدم اٹھاتا تاہم نابغہ روزگار شخصیات سب کچھ درک کر رہی ہوتی ہیں۔ علاقے کے بعض متعصب لوگوں کے رویہ کو آپ دیکھ اور سمجھ رہے تھے لیکن ان سب کے باوجود جو اسلامی اور قبائلی اقدار کی پاسداری کا تقاضہ تھا آپ نے ویسا ہی کیا۔

چونکہ اس کتاب میں اختصار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے لہٰذا ذیل میں فہرست وار چند

اقدار کا تذکرہ کروں گا جو میر صاحب مرحوم کی شخصیت سے چھلکتی تھیں۔

۱۔ ملاقات میں اپنائیت وخلوص۔

۲۔ گفتگو میں صدق وصفا۔

۳۔ سادہ زیستی۔

۴۔ معاملہ فہمی۔

۵۔ اصول وقانون پسندی۔

۶۔ سخت اور مشکل مراحل میں خدائے لم یزل ولایزال کی ذات پر اعتماد اور انتہائی توکل۔

۷۔ اہل بیت سے توسل، خصوصاً حضرت امام حسینؑ سے عشق۔

۸۔ مہمان نوازی خصوصاً اجنبیوں پر زیادہ توجہ۔

۹۔ لوگوں کے کام آنا اور پھر ان پر یا کسی اور پر نہ جتلانا۔

۱۰۔ اگر کسی سے کوئی کام لیا تو تواضع کے ساتھ اتنا شکریہ ادا کرتا کہ وہ خود شرمندہ ہو جائے۔ نیز دوسرے لوگوں کو بھی بتلاتا کہ میں نے فلاں کو زحمت دی اور اس نے یہ کام کر دیا وغیرہ۔

۱۱۔ سخت ترین مالی بحران میں بھی اپنے حالات کو ظاہر نہ کرنا اور نہ ہی کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا۔

۱۲۔ شجاعت وبے باکی۔

اے کاش! خدا توفیق دے کہ میر صاحب مرحوم کی زندگی کے آخری ایام کو قلمبند کرسکوں۔ جب بھی ہوش میں آتے عاجزی اور سپاس گزاری کے جذبے سے شکریہ ادا کرتے اور کوئی ایسی بات ہدیہ کر دیتے کہ خواہ مخواہ دل سے دعا نکلتی کہ پروردگار! میر صاحب کو دوبارہ صحت بخش دے کہ ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ کسی طرح اسلامی تحریک کے کارکنوں کی نذر کیا جاسکے۔

میر نادر عزیز کرد کا شمار عہد ساز شخصیات میں ہوتا ہے۔ بلوچستان کی اُن نامور افراد میں سے ایک تھے کہ جنھوں نے واقعات کو قریب سے مشاہدہ کیا۔ ایک ایک لمحے کے خود چشم دید گواہ بنے۔ وہ ہمیشہ حقیقت اور سچائی کی تلاش میں رہے۔ ان کا سیاسی سفر ایک قوم پرست رہنما کی حیثیت سے شروع اور اختتام سرخ انقلابی اسلام پر ہوتا ہے۔ اُن کے پاس انسانیت کے لئے درد رکھنے والا دل تھا۔ وہ ہمیشہ حق، انصاف، عدل اجتماعی کے لئے کوشاں رہے۔ وہ محروم و پابرہنہ لوگوں کے لئے انقلابی معاشرے کا قیام چاہتے تھے۔ وہ آج ہر چند ہم میں نہیں لیکن اُن کے افکار ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

بلوچستان ہسٹوریکل سوسائٹی

پوسٹ بکس 31 جی۔ پی۔ او کوئٹہ